فہرست مضامین

تعارف	۱۱
تعمیر سیرت کا کام اور اس کے تقاضے	۱۴
کردار کے بحران کے حوالے سے اہم مباحث	
تعمیر سیرت کے کام کی اہمیت	۱۴
تعمیر سیرت کا پہلا نکتہ	۱۵
تعمیر سیرت تحریک کا دوسرا نکتہ	۱۷
سیکولرزم، تعمیر سیرت میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتا	۱۷
ظالمانہ ریاستی نظام کے پیدا کردہ حجابات اور اس کے اثرات ایک نظر میں	۲۰
اہل اللہ سے دوری اور ان کی بے قدری کے نتیجے میں افراد معاشرے کو ملنے والی سزا	۲۲
قلبی سکون کے بغیر تعمیر سیرت کے کام میں خطرہ کا ہونا	۲۳
تعمیر سیرت کے کام میں فکر آخرت کا کردار	۲۵

تعمیر سیرت کے بحران میں عشق کی آگ کے بجھ جانے کا کردار	۲۶
تعمیر سیرت، دل کے تالے کو کھولے بغیر نہیں ہوسکتی	۲۸
دوسروں کی فکر سے زیادہ اپنی فکر کا ہونا	۲۸
تعمیر سیرت کا ایک اہم تقاضا تعصب وتنگ نظری سے حفاظت	۲۹
تعمیر سیرت کے بحران میں قرآن سے دوری کا عمل دخل	۳۰
تعمیر سیرت میں انسان کی حقیقی نوعیت کو سمجھنا ناگزیر ہے	۳۲
تعمیر شخصیت میں مراقبۂ موت کا کردار	۳۴
سلف صالحین کی فکر سے بھرپور استفادہ کے بغیر تہذیب نفس کا نہ ہونا	۳۵
بعض اسلامی مفکروں کے کام کے مثبت پہلوؤں کی قدر ضروری ہے	۳۶
نئی تشریح اسلام کے کچھ نتائج ومضرات	۳۷
علمائے کرام کے بارے میں اعتراضات کی نفسیات اور اس کے منفی اثرات	۳۹

	اسلام کے لئے سازگار ماحول اور حکومت کی ضرورت	۴۰
	مذہبی افراد کو ایک دوسرے سے بدگمانی سے بچانے کے کام کی اہمیت	۴۲
	ہماری نسلوں کی قابل رحم حالت اور انہیں بچانے کے لئے فکرمندی کی ضرورت	۴۳
	مسلمان حکمرانوں کا المیہ	۴۴
	قوموں کی زندگی اور موت وحیات کا اپنی تہذیب سے وابستہ ہونا	۴۵
	ہمارے حکمرانوں کا ایک ہی ادا کا حامل ہونا	۴۷
	مادیت پرست معاشرے کی المناک تصویر	۴۸
	میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی	۴۸
	اس دور کی غیر معمولی حساسیت کی بیماری اور اس کے ازالہ کے لئے فکرمندی کی ضرورت	۵۱
	خود احتسابی سے محرومی کے نتیجہ میں جنم لینے والے امراض	۵۳

	ہر نفس کی کہانی	۵۴
	باہر کے حالات کا، اندر کے احساسات کا نتیجہ ہونا	۵۶
	ہماری ریاست وسیاست کا بڑا المیہ	۵۷
	ذہین افراد کا حقائق سے ناآشنائی کا المیہ	۶۰
	اپنی ذات کی فراموشی کی قیمت پر دوسروں کی عیب جوئی کی روش	۶۱
	وہم کی بڑھتی ہوئی بیماری خوداعتمادی کے بحران کا نتیجہ	۶۳
	اہل عقل کی اہل تصوف کے خلاف محاذ آرائی	۶۴
	ذہانت کے استعمال میں عدم احتیاط سے پیدا ہونے والی خطرناکیاں	۶۵
	جاوید احمد غامدی صاحب کی فکر کے حوالے سے کچھ اہم مباحث	۶۷
	تجدد پسندی کی حامل شخصیت استاد وشاگرد کا کردار ایک نظر میں	۷۰
	جاوید صاحب جیسے اہل عقل کے غور وفکر کے لئے	۷۵
	فکر مودودی کے ردعمل کے اثرات سے بلند ہونے کی ضرورت	۷۶

	اپنی فکر کو مکتبہ فراہی کی طرف منسوب کرنا اس کی وضاحت	۷۷
	دجالیت کا بڑھتا ہوا فتنہ اور اس سے بچاؤ کے لئے کوششوں کی ضرورت	۷۹
	مال ودولت کی محبت اور اس کے نقصانات کا جائزہ	۸۱
	دنیا ودولت اللہ کے رسول اللہ ﷺ کی نظر میں	۸۴
	مجاہدوں سے حقائق و معارف کا حاصل ہونا	۸۷
	نت نئے مسائل کے شکار انسان کی حالت زار	۸۸
	قلب کی ہمہ گیریت کو سمجھنے کی ضرورت	۹۰
	علم ومعرفت کے حصول کے لئے کلی وقت کی ضرورت	۹۴
	اخلاص و بے نفسی کا، متوجہ الی اللہ ہونے سے پیدا ہونا	۹۵
	محاسبہ نفس کے عمل کا مسلسل جاری رہنا ناگزیر ہے	۹۶
	شخصیت کی تعمیر میں اہل تصوف کا کردار کچھ اہم مباحث	۹۷

	دور جدید میں تصوف کے بعض اہم اصولوں کی نشاندہی (سالکوں کے لئے)	۹۸
	روحانی استاد اور طالب کے بعض اہم معاملات	۱۰۲
	اہل اللہ کی صحبت کے کچھ ثمرات	۱۰۵
	حقیقی اہل اللہ کے دل سے سچائیوں کا پھوٹ کر نکلنا اور ان کے فیوض سے محرومی کا المیہ	۱۰۹
	تصوف میں تین چیزوں کا شکاری کے جال کے مثل ہونا	۱۱۲
	مجاہدوں کے ذریعہ نفس کی پلصراط طے کئے بغیر کام نہیں بنتا	۱۱۴
	اپنے نفس کی یاد دہانی کے لئے تصوف کے بنیادی اصولوں کی نشاندہی	۱۱۶
	ہم جیسے صوفیائے خام پر تین تفکرات کا غالب ہونا	۱۱۹
	تصوف سے صاحب کردار افراد کے ملنے کی دشواری (ایک سوال کے جواب میں)	۱۲۲
	مراقبہ کی راہ میں حائل بعض مشکلات اور ان کا حل	۱۲۵

	محبت اور اس کی خصوصیات	۱۲۹
	اہل اللہ کے خوف وخطر وفنائیت کی حالت	۱۳۲
	صوفی کو احتیاطی تدابیر کی ضرورت	۱۳۳
	کچھ دکھ سے بھرے ہوئے واقعات	۱۳۵
	ذکر میں ناغہ کے منفی اثرات اور اس کے اسباب	۱۳۸
	ذکر سے بے پناہ حلاوت کا عطا ہونا	۱۴۲
	تعمیر شخصیت کے حوالے سے کچھ اہم نکات	۱۴۵
	شخصیت کے توازن کا اسم ذات کے ذکر سے قائم ہونا	۱۴۵
	جدید انسان کا اضطراب کا سراپا مجسمہ ہوجانا	۱۴۵
	باطن میں موجود خزانوں سے ناآشنائی اور اس کے اثرات	۱۴۶
	صوفی، عشق کا پورا جام نوش کئے بغیر کامل صوفی نہیں بن سکتا	۱۴۷

	خود پسندی سے حق تک رسائی ممکن نہیں	۱۴۸
	وقت کے ایک حصہ کی قربانی سے عظیم نعمت کا حاصل ہونا	۱۴۸
	راہ سلوک کا دو دھاڑی تلوار ہونا	۱۴۹
	مادی خوشحالی وراحت کے نام پر باطن کو تاریک بنانے کی کاوشیں	۱۴۹
	زخمی شیر، گدھے اور انسان کی مثال	۱۵۱
	بے بقا زندگی اور انقلابات زمانہ سنبھلنے کی ضرورت	۱۵۳
	داعی وصوفی کا اللہ کی نصرت کے قانون میں داخل ہونا	۱۵۶
	روح اور مادی زندگی کے درمیاں جاری کشمکش اور بچاؤ کی صورت	۱۵۸
	حرف آخر	۱۵۹

تعارف

معاشرہ میں تعمیر شخصیت کے لئے تحرک کی ضرورت

اس وقت معاشرے کی سطح سے لے کر عالمی سطح تک انسانیت ایک ہمہ گیر بحران سے دوچار ہے، یہ بحران بنیادی طور پر تعمیر شخصیت کا بحران ہے، جس کی وجہ سے انسانیت ہر سطح پر فساد سے دوچار ہے۔ تعمیر شخصیت سے ہماری مراد ایسا انتظام کرنا ہے، جس سے فرد وافراد کے نفس امارہ پر نفس لوامہ غالب آجائے، اس طرح آہستہ آہستہ فرد وافراد کے نفسانی وجود پر روحانی قوتیں غالب سے غالب تر ہوتی جائیں، تاکہ بندوں کا اپنے آقا ومولا سے تعلق مستحکم ہوسکے، اس تعلق کے استحکام کی وجہ سے انسانی شخصیت اور اس کے باطن میں نور جگمگانے لگے (**يَهْدِيْ اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاءُ**) یہ نور، فطرت سلیمہ کی بیداری، ضمیر یعنی نفس لوامہ کی قوت اور دل وروح کی صلاحیتوں کے غلبہ کے نتیجہ میں ہی بیدار ہوگا، جس سے انسان، انسانیت سے بہرہ ور ہوگا، دوسرے انسانوں کے بارے میں اس کی خونخوارانہ اور بے رحمانہ جبلت پر کنٹرول ہوگا۔ انسانوں کے بارے میں اس کی دردمندی، فکرمندی، رواداری، اپنائیت، شفقت اور محبت کے جذبات بیدار سے بیدار تر ہوں گے، دولت پر اس کی فدا کارانہ اداؤں میں غیر معمولی کمی واقع ہوگی۔

تعمیر شخصیت کا یہی وہ پروگرام ہے، جو مسلمان کی حیثیت سے ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ تعمیر شخصیت کے اس سارے پروگرام کا تعلق اللہ سے والہانہ محبت کے استحکام کے کام سے ہے۔ اللہ کی یہ محبت ہی فرد وافراد کو آدابِ انسانیت اور اللہ کے بندوں سے محبت کے سلیقہ سے آشنا کرے گی۔

آج دنیا میں مسلمانوں کے خلاف کفر کی قوتوں نے ہر جگہ جنگ جوئی کی مہم شروع کی ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کا خون سب سے زیادہ سستا ہوگیا

ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اپنی پاکیزہ تہذیبی بنیادوں پر تعمیر شخصیت کے حوالے سے مسلمانوں نے کسی بھی سطح پر وہ کردار ادا نہیں کیا، جو انسانوں کے لئے مینار نور بن سکے، جو انسانوں کو حیوانیت سے بلند کرکے، آداب انسانیت اور سلیقہ انسانیت سکھا سکے۔ تعمیر شخصیت کے اعتبار سے مسلمان خود ہولناک بحران سے دوچار ہیں۔ مسلمانوں کا مقام تو یہ تھا کہ وہ اپنے کردار سے انسانیت تک توحید، رسالت اور اللہ سے والہانہ محبت کے پیغام کو اجاگر کرتے، اس طرح ان کے لئے حیوانیت سے بلند ہوکر، پاکیزہ نصب العین کا زندہ نمونہ پیش کرتے۔

یہ کام نہ ہونے کی وجہ سے کفر کی قوتیں مسلمانوں کے بارے میں خونخوارانہ عزائم کی حامل ہوگئی ہیں، یہ دراصل ایک اعتبار سے مسلمانوں کو اپنی منصبی ذمہ داریوں کی عدم ادائیگی کی سزا ہے، جو دنیا میں انہیں مل رہی ہے۔

اتنی سخت سزا ملنے اور ایک ملک کے بعد دوسرے ملک کے مسلمانوں کا خون سے رنگیں ہونے کا منظر دیکھنے کے باوجود مسلمانوں کا بیدار نہ ہونا اور توحید اور اللہ سے محبت کی بنیاد پر اپنے کردار کی تعمیر کا کام ہاتھ میں نہ لینا اور اس کام کو اہمیت نہ دینا، بڑی المناک بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم امت (پاکستانی ملت سمیت) میں موجود سارے فساد اور سارے بحرانوں کا شاخصانہ ایک ہی ہے، اور وہ اپنی پاکیزہ تہذیب کی بنیادوں پر تعمیر شخصیت کے کام کو انداز کرنا ہے اور اس کام کو اہمیت نہ دینا ہے نیز دوسری مادہ پرست قوموں کی طرح دنیاوی زندگی اور حیوانی زندگی کو فیصلہ کن اہمیت دینا ہے۔

ضرورت ہے کہ تعمیر شخصیت کے کام کو اہمیت دے کر، مسلمان سارے بحرانوں سے نکلنے کے لئے کوشاں ہوں، تعمیر شخصیت کا لازمی نتیجہ پاکیزہ نصب العین کے مطابق اپنی قومی وملی زندگی کی تشکیل نو اور تعمیر نو کرنا ہے، اس کام سے جتنی غفلت ہوگی، اسی مناسبت سے مادہ پرست قومیں مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہوتی جائیں گی اور ان کے جملہ قدرتی وسائل پر قبضہ کے لئے

ان پر حملہ آور ہوں گی اور ان کے لئے رونے اور دادوفریاد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہوگا، اللہ کی مدد اس لئے نہیں آئے گی کہ نفس پرستی اور مادہ پرستی کی اداؤں کے غلبہ کی وجہ سے انہوں نے اللہ کو ناراض کیا ہوا ہے، اللہ کی اس ناراضگی کی وجہ سے اللہ نے دشمن کو مسلمانوں کے حوالے سے دلیر کردیا ہے۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ مسلمانوں میں تعمیر شخصیت کا منظّم طور پر کام نہ ہونے کی وجہ سے مسلم معاشرے میں سیاسی، سماجی، اور تعلیمی سطح پر مثبت اور صحتمند تحریک کے ابھرنے اور مسلمانوں کی نشاہ ثانیہ کی تحریک کے پھلنے پھولنے کے امکانات بہت کم سے کم ہوگئے ہیں، اس لئے کہ نفس پرستی اور مادہ پرستی کی مصروفیات نے ان کے ضمیر کو اجتماعی طور پر مردگی کی حالت تک پہنچایا ہے۔

زیرنظر کتاب میں یہی پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان اپنی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے، معاشرے میں تعمیر شخصیت کی تحریکوں کو طاقتور سے طاقتور بنانے کے لئے فکرمندی وحساسیت کا مظاہرہ کریں، تاکہ ہماری سیرت وکردار میں اپنی پاکیزہ تہذیب کی بہتر نمود ہوسکے، اس طرح ہم اپنے آپ کو سنوارنے، مہذب بنانے اور اپنے تزکیہ کے نتیجہ میں اللہ کی مدد کے مستحق ہوسکیں، اور اللہ کے عتاب کی جس حالت میں اس وقت ہم مبتلا ہیں، اس سے بچنے کی صورت پیدا ہو سکے۔

زیرنظر کتاب کے مضامین ہفتہ وار اصلاحی نشست کے لئے لکھے گئے تھے اور وہاں پڑھے گئے، مقصود ذہنی وفکری اصلاح کے ساتھ ساتھ باطنی اصلاح بھی ہے، اللہ تعالیٰ ہماری اس معمولی کوشش کو اپنے ہاں قبولیت کا شرف عطا فرمائے۔ **(آمین)**

۱۶ اکتوبر ۲۰۱۷ء **محمد موسیٰ بھٹو**

تعمیر سیرت کا کام اور اس کے تقاضے

کردار کے بحران کے حوالے سے اہم مباحث

پاکیزہ تہذیبی بنیادوں پر تعمیر سیرت کا موضوع سب سے اہم موضوع ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ فرد وافراد کی دنیوی واخروی فوز وفلاح ہی اسی سے وابستہ ہے، اس سے محرومی کے نتیجہ میں فرد کے لئے یہ دنیا اور اخروی دنیا جہنم کا نمونہ بن جاتی ہے۔

رونا پیٹنا، ظالموں کے خلاف آہوں کا نکلنا، سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ، غریبوں کا غربت وافلاس میں پس کررہ جانا، خونریزی کے منظر کا عام ہونا، ہر سطح پر مفادات کی جنگ کا تیز سے تیز تر ہونا، بڑے لوگوں کے احتساب کے نظام کا ختم ہونا وغیرہ یہ ساری چیزیں تعمیر سیرت کے بحران ہی کا نتیجہ اور اس کے ثمرات ہیں، ان چیزوں نے دنیا کو چھوٹے سے جہنم کے منظر نامہ میں تبدیل کر دیا ہے۔

تعمیر سیرت کے کام کی اہمیت

تعمیر سیرت کیا ہے؟ ہماری نظر میں تعمیر سیرت اپنی شخصیت کو سنوارنے، نکھارنے، اسے انسانیت کے شایانِ شان بنانے، سیرت وکردار میں پاکیزگی پیدا کرنے، باطن کی تطہیر کے ذریعہ ظاہر کو مجسمۂ اخلاق بنانے، اپنی ذات سے افراد معاشرہ کو نقصان نہ پہنچانے، مفادات وخواہشات سے دستبردار ہوکر، انسانیت کا بھلا چاہنے، دنیاوی گندگیوں اور آلائشوں سے بچنے، دل کو پاک وصاف بنا کر، اسے اعلیٰ انسانی اوصاف کا حامل بنانے، انسانیت کی حالت زار پر رحم کھاکر، اس کی بھلائی وفلاح کے لئے کام کرنے، انسانی دردوغم سے سرشار ہونے، سب کا بھلا چاہنے، تعصب، دشمنی روایتی سیاست اور مخالفت برائے مخالفت کی سطح سے بلند ہوکر، اعلیٰ

مقاصد کے لئے کام کرنے، اخلاق وبےنفسی پر مشتمل کردار کا حامل ہونے، اپنوں اور غیروں سب کا بھلا چاہنے، انسانیت کو درپیش بحران سے نکالنے کے سلسلہ میں اپنے حصہ کا کردار ادا کرنے، اللہ کی غریب، مسکین اور مفلوک الحال مخلوق کی بھلائی کے درد میں گھلتے رہنے، وغیرہ وغیرہ کا نام ہے۔

اس اعتبار سے ہم اگر محلّہ ،علاقہ ، اور قومی سطح سے لے کر عالمی سطح تک کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ پوری انسانیت تعمیر انسانیت کے حوالے سے شدید بحران سے دوچار ہے۔ قوم، ملت اور انسانیت کی ہر سطح کی قیادت کو اندر سے کھرچیں گے تو معلوم ہوگا کہ ذاتی مفادات، انسانیت کو پامال کرنے کے جذبات، حیوانی خواہشات، نفس پرستی کے بت اندر میں اس قدر مستحکم ہو چکے ہیں کہ گویا اس دور کی انسانیت کی ساری قیادت اور سارے مؤثر طبقات مادی مفادات کے اسیر بن چکے ہیں اور یہ مراعات یافتہ طبقات پوری انسانیت کو جانوروں کی طرح ہنکانے اور ان کے خون پسینہ کی محنت سے بڑے سے بڑا بننے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ اس مقصد کے لئے عالمی سطح سے لے کر قوموں کی سطح تک کے حکمرانوں، افسروں اور مالداروں نے مل کر ایسا اجتماعی نظام تشکیل دیا ہے، جس میں انسان کو ترقی یافتہ جانور سمجھکر، اس کی حیوانی جبلت کو طاقتور سے طاقتور تر بنانے کی آخری حد تک کوششیں جاری ہیں، جب قوموں اور ملکوں کی یہ صورتحال ہوجائے تو تعمیر سیرت کا کام کیسے ہوسکتا ہے۔

اس طرح کی صورتحال کا لازمی نتیجہ انسانیت کی پامالی اور مادہ پرستی کی قوتوں کے غلبہ کی صورت میں ہی ظاہر ہوسکتا ہے۔

ان حالات میں اجتماعی سطح پر نہ سہی، انفرادی اور محلہ کی سطح پر بھی اگر تعمیر سیرت کا کام شروع ہو تو بھی غنیمت ہوگا۔

تعمیر سیرت کا پہلا نکتہ

تعمیر سیرت کا پہلا نکتہ اور پہلا تقاضا یہ ہے کہ فرد میں یہ شعور اجاگر ہوجائے کہ معاشرے میں پیدا ہونے والے فساد کا مرکز اس کی اپنی ذات ہے۔ وہ حب جاہ،

حب مال، حرص وہوس، حسد اور دوسروں کی تحقیر کے نفسانی جذبات واحساسات سے سرشار ہے، وہ اپنی نفسی خرابیوں سے اپنے ساتھ وابستہ افراد کی اذیت وتکلیف کا موجب بن رہا ہے اور اس کے اندر سے پھوٹنے والا فساد ہی معاشرے کو فساد میں مبتلا کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ اگر فرد کو معاشرے میں اتنی بڑی حیثیت حاصل نہیں ہے کہ وہ لوٹ مار، رشوت اور ظلم کا موجب بنے، تاہم اس کے اندر موجود نفس پرستی کے زہریلے اثرات فضا کو مسموم کرنے کا ذریعہ تو ضرور بن رہے ہیں، اس لئے تعمیر سیرت کی تحریک کا ہر فرد سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر کی پاکیزگی وصفائی کے لئے کوشاں ہو، نفسی قوتوں کو مغلوب ومفتوح کرنے کے لئے مجاہدوں سے کام لے، تاکہ اس کی شخصیت کے باطن سے نکلنے والی مثبت شعاؤں سے افرادِ معاشرہ کو طاقتور اور مثبت شعائیں اور روشنی حاصل ہو۔

اپنی ذات کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسروں کی تعمیرو سیرت کی فکرمندی دراصل نفس کا فریب ہے، اس طرح نفس، فرد پر قبل از وقت دوسروں کی فکر مسلط کرکے، اس کی شخصیت کے باطن کو تاریک رکھنا چاہتا ہے۔

فرد کتنا ہی عالم، دانشور اور فاضل ہو، اس سے تعمیر شخصیت کی تحریک کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اس کام کا آغاز اپنی ذات سے کرے، اپنے آپ کو مہذب بنانے، سنوارنے اور اپنی نفسی خرابیوں سے دوسروں کو بچانے کے لئے کوشاں ہو، ویسے بھی عام طور پر عالم اور دانشور کی شخصیت علم وذہانت کی وجہ سے دعویٰ اور انانیت کے مرض میں زیادہ شدت سے مبتلا ہوتی ہے، اس لئے عام لوگوں کے مقابلہ میں معاشرے میں پیدا ہونے والے انتشار وخلفشار میں ان کا کردار زیادہ ہی ہوتا ہے، دیکھا گیا ہے کہ فرد، علم ودانش میں جتنا زیادہ آگے ہے، وہ اس زعم میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کی فکر اور اس کے خیالات ہی صحیح اور حرف آخر ہیں، معاشرے پر اسی کی فکر اور اسی کے خیالات کا چرچہ ہونا چاہئے۔ اس سے لاشعور میں موجود جو جذبہ کارفرما

ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ معاشرے میں اسے عزت وشہرت حاصل ہو، اور اسے بڑے دانشور اور مفکر کی حیثیت حاصل ہو۔

ہمارا سیاستدان ایک دوسرے سے لڑائی میں اپنی قوتیں اس لئے صرف کررہا ہے، تاکہ وہ خود کرسیٔ اقتدار پر فائز ہو اور ملک وقوم کو لوٹ کر زیادہ سے زیادہ دولت بنانے اور شہرت کے حصول کے جو مواقع دوسرے سیاستدان کو حاصل ہیں، وہ مواقع ان کی بجائے اسے حاصل ہوں، سیاستدانوں کی نفس پرستی کے انہی جذبات نے قوم وملت کو عرصہ سے ہمہ جہتی فساد سے دوچار کر دیا ہے۔

تعمیر سیرت تحریک کا پہلا نکتہ ہی یہی ہے کہ اپنے نفس کی تہذیب کا عمل شروع ہو، تاکہ نفسی جذبات حداعتدال میں رہیں۔

تعمیر سیرت تحریک کا دوسرا نکتہ

تعمیر سیرت تحریک کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب اپنی اصلاح کے کچھ مراحل طے ہوں تو افراد معاشرہ کو اخلاقی طور پر سہارا دینے اور سنبھالنے کی کوششیں شروع ہوں، تاکہ معاشرہ کی اصلاح کا عمل جاری ہوسکے۔ ویسے بھی دعوتی کام، اسلامی نقطہ نگاہ سے دینی فریضہ ہے، جس کی عدم ادائیگی، فرد وافراد کو گناہگار بنا دیتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے جو افراد نفس پرستی کی قوتوں سے مغلوب ہوں، وہ یہ کام کر ہی نہیں سکتے۔ اس لئے اپنی اصلاح کے عمل میں کچھ بہتری کے ساتھ ہی دوسروں کی اصلاح کی ایک حد تک فکرمندی ضروری ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے، کے مصداق اسی سے معاشرہ تاریکی سے نکل کر روشنی میں داخل ہوگا۔

سیکولرزم، تعمیر سیرت میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتا

تعمیر سیرت اور انسانیت سازی کا کام سیکولرزم اور عقلیتِ محض کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ خدا، مذہب، اور وحی کی رہنمائی کے بغیر عقلیت، مادی نظریات کو

تخلیق دینے اور مادی ترقی اور سائنسی ایجادات کا ذریعہ تو بن سکتی ہے، لیکن سیکولرزم سے انسان کو انسان بنانے کے کام کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ تعمیر سیرت کے کام کا تعلق نفسی قوتوں پر روحانی قوتوں کو غالب کرکے، نفس کو مہذب بنانا، اسے اپنی خالق ہستی کا مطیع ووفادار بنانا اور اس خالق کے اوصاف کی اپنی زندگی میں عکس ریزی کرنا، آخرت کی زندگی پر یقین رکھکر، اپنے خالق کے سامنے اپنی زندگی کے سارے معاملات کے سلسلہ میں جوابدہی کے احساس کا غالب ہونا، زندگی گذارنے کے لئے اللہ کی طرف سے رسولوں کے ذریعہ بھیجی گئی رہنمائی پر یقین رکھنا اور دل کی صلاحیتوں کو بیدار کرنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر نفس کے درندے کے سنورنے، اس کے مہذب ہونے اور اللہ کی زمین پر اس کے عاجز ووفادار بندے کی حیثیت سے زندگی گذارنے کے قابل ہونا ممکن نہیں۔ سیکولرزم کی بنیاد عقلِ محض ہے، اور عقلِ محض ماوریٰ طبع حقائق تک رسائی سے قاصر ہے، عقل کے سامنے زندگی کے بارے میں جو نقشہ ہوتا ہے، وہ مادی دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے اور تلاش وتحقیق کے ذریعہ اشیائے کائنات میں موجود قدرتی قوانین اور ان کی خصوصیات کی کھوجنا اور مادی طور پر عروج ہوتا ہے، جب کہ تعمیر سیرت اپنے خالق سے والہانہ محبت کی متقاضی ہے، تعمیر سیرت کائنات میں خالق کی تخلیق کے ذریعہ اس کی معرفت کی متقاضی ہے۔ تعمیر سیرت انسانی فطرت کی گہرائیوں تک پہنچ کر، فطرت سلیمہ میں موجود انسانی جوہروں تک رسائی کی طالب ہے۔ تعمیر سیرت انسانوں کی دنیا وآخرت کی بھلائی وبہتری کا ہمہ گیر وہمہ جہتی پروگرام چاہتی ہے۔

یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو عقلیتِ محض اور سیکولرزم کے ذریعہ ممکن نہیں، اہل مغرب نے سیکولرزم کی بنیاد پر جس تہذیب کو جنم دیا ہے، اس تہذیب میں انسان سازی اور تعمیر سیرت کے نام پر یقیناً بعض اچھی چیزیں موجود ہیں، جن کی وجہ سے انہیں انفرادی واجتماعی زندگی میں بہت ساری سہولتیں حاصل ہیں۔ قانون کی حکومت،

عدل وانصاف کا نظام، تمدنی ترقی، ریاستی وقومی ذمہ داریوں کے حوالہ سے احساس کا ہونا وغیرہ۔ لیکن اپنے خالق کی عدم معرفت، نفسی قوتوں سے ناآشنائی اور مادی قوتوں کے غلبہ کی وجہ سے ان کی روح آخری حد تک بیمار ہوچکی ہیں۔ نیز ان کی دل کی صلاحیتیں مفلوج ہوچکی ہیں۔ دل وروح کی مفلوجی کی حالت میں عقلِ محض کے ذریعہ زندگی کے دشوار گذار مسائل کا حل، زندگی، کائنات اور انسان کی حقیقت اور اس کے تقاضوں کو سمجھکر، اس کا بہتر اور انسانی فطرت سے ہمہ آہنگ حل تلاش کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ ساری انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے جب بھی عقل اور نفس کے غلبہ کے نتیجے میں اپنے حقیقی خالق کی معرفت سے انکار کی روش اختیار کی، وہ سنگین مسائل کا شکار ہوئی اور عیش وعشرت، لذت کام ودہن، انسانیت کی پامالی اور مادی زندگی پر ٹوٹ پڑنے کی روش ہی اس کا نصب العین بن گئے ہیں (اس طرح کی مادی زندگی جو عقلیت وسیکولرزم کے زیر اثر مقصود بن جاتی ہے) وہ دراصل انسانی فطرت اور اپنے حقیقی خالق ومعبود سے جنگ جوئی کے مترادف ہوتی ہے۔

تعمیر سیرت کا کام تو دراصل اپنے حقیقی خالق ومعبود سے معرفت اور اس سے سچی محبت کے نتیجہ میں ہی ہوسکتا ہے۔ اس کی دوسری کوئی صورت موجود نہیں۔ اس وقت انسانیت، تعمیر سیرت کے اعتبار سے جن سنگین مسائل کا شکار ہے، اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انسان سازی اور تعمیر سیرت کے مسئلہ کو عقلیتِ محض اور سیکولرزم کے ذریعہ حل کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ ان کوششوں کا نتیجہ ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے اور جنگوں اور تصادم کی صورت میں ہی سامنے آرہا ہے۔ پچھلے دوڈھائی سوسال سے انسانیت، سیکولرزم کے نام پر اس صورتحال سے دوچار ہے۔ اس لئے ہماری نظر میں تعمیر سیرت کے لئے ناگزیر ہے کہ ایسا نظام وجود میں آئے، جس کے ذریعہ فردوافراد کو اپنی سچی معرفت حاصل ہوسکے اور ان پر یہ بات واضح ہو سکے کہ کائنات میں اسے اشرف المخلوقات کا مقام حاصل ہے۔ نیز اس وسیع تر کائنات میں

اسے خالق کائنات کے خلیفہ کی حیثیت حاصل ہے اور یہ ساری کائنات اس کی خدمت کے لئے بنائی گئی ہے اور اسے دنیا میں خلیفہ کی حیثیت سے کردار ادا کرنا ہے، یہ کام معرفتِ نفس اور معرفتِ رب کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔

یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ عالمی سرمایہ دار نے ہماری ملت کے ذہین ومؤثر اور جدید طبقات کو مادی زندگی کو خوبصورت سے خوبصورت بنانے کا نشہ دے کر، اسے بے حس بنادیا ہے۔ اس طرح حقیقی تعمیر سیرت، جو اللہ کے استحضار اور آخرت کے دھیان کے غلبہ کے نتیجہ میں حاصل ہوسکتی ہے، اس سے دور کر دیا ہے اور مادیت پر فداؤں کی اداؤں سے اسے سرشار کر دیا ہے۔

ظالمانہ ریاستی نظام کے پیدا کردہ حجابات اور اس کے اثرات ایک نظر میں

تعمیر سیرت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جو پیدا ہوگئی ہے، جس نے معاشرے کو زوال پذیر معاشرے میں تبدیل کردیا ہے، وہ ریاستی نظام کی ظالمانہ بنیادوں پر تشکیل کی رکاوٹ ہے۔ اس ظالمانہ نظام کا نتیجہ ہے کہ حکمرانوں اور افسروں سے لے کر صنعتکاروں، تاجروں اور وکیلوں سب پر مال بنانے کی حرص وہوس کا جنون سوار ہے۔ چنانچہ لوگوں کے حقوق تلف کرکے، قومی خزانے میں خورد برد کے ذریعہ، چھوٹے چھوٹے کاموں پر لوگوں سے بھاری رشوت لے کر، قومی تعمیر کے ہر منصوبے میں حکمرانوں، افسروں، ٹھکیداروں کی بھاری کمیشن کے ذریعہ یا ٹیکس کی عدم ادائیگی، وکیلوں کی طرف سے پریشان حال افراد سے چھوٹے سے چھوٹے کیسوں پر لاکھوں روپے وصول کرنے کی روش، عدلیہ کے پیچیدہ نظام، جس میں لوگوں کو برسوں تک بعض اوقات زندگی بھر پیشیاں بھگتنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ یہ ظالمانہ نظام ایسا ہے، جس نے افراد معاشرہ میں کہرام کی حالت پیدا کردی ہے اور اس نظام اور اس کے چلانے والوں کے خلاف مظلوموں کی دلوں سے آہیں نکلنا

شروع ہوگئی ہیں، بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ کوئی ایسا فورم موجود نہیں ہے، جہاں مظلوموں کو سہارا ملتا ہو اور ان کے لئے داد رسی کی صورت پیدا ہوتی ہو۔

جس ریاستی نظام میں رشوت، ظلم، بددیانتی، خیانت، لوٹ مار، اللہ کی بے بس مخلوق کے خون کو آخری حد تک نچوڑنے کے لئے سو بہانے تراشے جاتے ہوں، بلکہ ریاستی نظام کی بنیاد ہی ظلم پر رکھی گئی ہو، اس نظام سے وابستہ حکمران، افسران، صنعتکار، تاجر اور وکیل وغیرہ قساوت قلبی اور سنگ دلی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس ظالمانہ نظام کا سب سے نقصاندہ پہلو یہ ہے کہ اللہ کی بے بس مخلوق یعنی مظلوموں کی آہوں کی وجہ سے اس نظام کا حصہ بننے والے افراد پر حجابات وظلمات طاری ہوجاتے ہیں اور ان کا باطن سیاہی وتاریکی سے سرشار ہوجاتا ہے۔

ان کی زندگیوں سے خیروبرکت رخصت ہونے لگتی ہے، وہ چاہے مادی اعتبار سے کتنے ہی خوشحال ہوں، لیکن لوگوں کی آہوں کی وجہ سے وہ سخت ذہنی دباؤ کا شکار رہتے ہیں۔ ان کی اولاد آوارہ گردی کی نذر ہوجاتی ہے۔ حق وصداقت اور نیکی کی باتیں قبول کرنے کی راہ میں ان کی یہ ظالمانہ روش حجاب بن کر سامنے آتی ہے۔

ایسے ظالمانہ ریاستی معاشرے میں اول تو انصاف وعدل پر مبنی قانون سازی ہوتی نہیں، اگر ہوتی بھی ہے تو رشوت، لوٹ مار سفارش اور ظالمانہ مزاج اس بہتر قانون سازی کے اثرات کو زائل کردیتا ہے۔

اس ظالمانہ نظام کے علمبردار ایک طرف تو اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ اور حرص وہوس کی تسکین کے لئے مال کمانے کے لئے پورے ریاستی نظام کو خیانت، بددیانتی، لوٹ مار اور رشوت کی صورت میں تبدیل کردیتے ہیں، دوسری طرف اس نظام کے اوپری سطح کے علمبردار عالمی کفر اور عالمی ساہوکار سے ملی بھگت کرکے ان کے عالمگیریت کے مقاصد کی تکمیل کے لئے کام کرتے رہتے ہیں۔

یہ ایسی سنگین صورتحال ہے، جس میں ہماری ریاست اور ہمارا معاشرہ مبتلا

ہوچکا ہے۔ اس ریاستی نظام کو بدلنے کی جدوجہد وقت کا اہم تقاضا ہے۔ اس کے بغیر معاشرے کی کوئی کل درست نہیں ہوسکتی۔ لیکن ریاستی نظام کو بدلنے کی جدوجہد اسی وقت بارآور ہوسکتی ہے، جب معاشرے میں باطنی بیماریوں سے محفوظ بہتر اور پاکیزہ کردار کے حامل افراد کی قابل ذکر ٹیم پیدا ہو، جو بدقسمتی سے اس وقت معاشرے میں موجود نہیں ہے۔ جو لوگ اس نعرہ کے ساتھ میدان میں آتے ہیں، ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ اقتدار سے پہلے ہی بڑی بڑی گاڑیاں اور بنگلے ان کا مسکن ہیں، ایسے افراد جن کا ہدف مادی خوشحالی اور راحت کا مادی سامان ہی ہو، وہ ریاستی نظام کی صحتمند بنیادوں پر تبدیلی کا کام کیسے کرسکتے ہیں؟

اہل اللہ سے دوری اور ان کی بے قدری کے نتیجے میں افراد معاشرے کو ملنے والی سزا

اس دور میں جب کہ افراد کو علمائے ربانی اور صاحبان دل سے مستحکم تعلق قائم کرنے کی زیادہ ضرورت ہے، تاکہ وہ قلبی سکون اور ذہنی تسکین سے بہرہ ور ہوسکیں، بدقسمتی سے ان کا یہ تعلق بہت زیادہ کمزور ہوگیا ہے۔ جو افراد علمائے ربانی سے رجوع بھی ہوتے ہیں تو وہ جلد ہی راہ فرار اختیار کرلیتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ نفس پرستی اور مادہ پرستی کی طوفانی لہریں ان کے دل کو الٹ پلٹ کردیتی ہیں۔ اس طرح اہل اللہ سے ان کا تعلق اس کمزور دھاگے کے مثل ہوتا ہے، جو معمولی زور دینے سے ٹوٹ جاتا ہے۔

اہل اللہ اور علمائے ربانیں سے اس دوری کا نتیجہ ہے کہ افراد معاشرہ سکون کے لئے ترستے رہتے ہیں اور ان کی زندگی اجیرن بن گئی ہے۔ خوشحال اور مالدار افراد ہوں یا غریب، اس معاملہ میں لگ بھگ سب کی حالت یکساں ہے، اس لئے کہ قلبی سکون کی دولت عظمیٰ تو مادی سازوسامان یا کثرت دولت سے حاصل نہیں

ہوسکتی، یہ دولت تو اہل اللہ کے ذکر کے نورانی ماحول کا حصہ بننے کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوسکتی ہے۔

اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے افراد معاشرہ کے لئے یہ زندگی باطنی سکون کے اعتبار سے سراپا محرومی کی زندگی بن گئی ہے جس پر دکھ واذیت کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

قلبی سکون کے بغیر تعمیر سیرت کے کام میں خطرہ کا ہونا

تعمیر سیرت کا قلبی سکون سے گہرا تعلق ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قلبی سکون کی دولت عظمیٰ سے بہرہ وری کے بغیر سیرت میں پاکیزگی، مزاج میں ٹھہراؤ اور بُردباری کی صلاحیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

قلبی سکون ایسی چیز ہے، جو ذہن کو انتشار اور دباؤ سے بچانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ قلبی سکون سے ہی فرد جملہ نفسیاتی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتا ہے، قلبی سکون سے ہی فرد اشتعال کی نفسیات سے بچ کر حالت اعتدال میں رہ سکتا ہے اور زندگی کے معاملات میں صحیح اور بہتر فیصلہ کرنے کے قابل ہوسکتا ہے، قلبی سکون، جس پر فرد کی تعمیر سیرت کی بنیاد قائم ہے، یہ چیز ایسی نہیں ہے، جو بازار سے خریدی جا سکے، یا وعظ ونصیحت کی باتوں اور کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہو سکے، بلکہ یہ دولت عظمیٰ اللہ کے ذکر سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ ذکر کا مزاج مستحکم ہوئے بغیر قلبی سکون کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔ کثرت دولت، مادی حسن سے بہرہ وری اور علم وذہانت یہ ساری چیزیں قلبی سکون میں معاون نہیں ہوسکتی اور قلبی سکون ہر فرد کی ایسی ناگزیر ضرورت ہے، جس کے بغیر وہ روزمرہ زندگی کے معاملارت کو بہتر طور پر سرانجام دینے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ قلبی سکون سے بے بہری فرد کو دوسروں سے ٹکراؤ وتصادم اور ان سے تعلقات کے بگاڑ اور بہت ساری معاشرتی خرابیوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ انسانی شخصیت کا سارا اعتدال، ٹھہراؤ اور سکون وسکینت قلب کے سکون ہی سے وابستہ ہے،

عالم ہو دانشور ہو، سرمایہ دار ہو یا جاہل، فرعونِ وقت ہو یا کوئی بھی ہو، وہ قلبی سکون کی بے بہا دولت سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اللہ کے ذکر کا سہارا نہ لے گا۔ اللہ کا ذکر بھی ایسا، جو دل کی گہرائیوں سے ہو۔

قوموں کی زندگی میں برپا ہونے والے سارے فساد اور تصادم کا بنیادی سبب یہی ہے کہ فرد کا دل بے چین ہے اور وہ سکون کی نعمت سے محروم ہے اور نفسی قوت نے دل کے سکون کو برباد کردیا ہے، اللہ کے نام سے منسلک ہونے سے ہی انسانی زندگی ہر طرح کے فساد سے بچ سکتی ہے۔ اس کی دوسری کوئی صورت موجود نہیں، اللہ کے ذکر کا مطلب توحید کے عقیدے کو اتنا مستحکم کرنا ہے کہ یہ دل اور نفسیات پر غالب ہوجائے اور یہ عقیدہ مزاج کا حصہ بن جائے، یہ حالت، تکرار ذکر کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس لئے فرمایا گیا **فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ.** ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جن کا دل اللہ کے ذکر کے سلسلہ میں سخت ہے یعنی ذکر کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں۔

ایسے افراد ہلاکت سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ آئے دن نت نئے حادثوں اور جھگڑوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ اللہ سے دور ہوجاتے ہیں، ان کی عبادت کی حیثیت رسمی نوعیت کی بن جاتی ہے۔ جس سے زندگی کا رخ بدلنے نہیں پاتا۔ **أَلاَ بِذِكْرِ اللّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوب.**

افراد معاشرہ میں موجود سنگ دلی، تنگ نظری، مزاج میں تشدد، اس سے جھگڑا، اس سے کھینچا تانی، اس کی تحقیر، اس کی گلا وغیبت وغیرہ یہ ساری روش قلبی سکون سے محرومی ہی کا نتیجہ ہے۔

جب فرد وافراد قلبی سکون سے بہرہ ور ہوتے ہیں تو وہ سکینت کی یہی خوشبو معاشرے میں تقسیم کرتے ہیں، جس سے معاشرے میں محبت، رواداری، شفقت، ایک دوسرے کی خیرخواہی اور مدد وتعاون کی فضا پروان چڑھتی ہے۔ اس طرح

معاشرہ ہر طرح کے انتشار سے محفوظ ہوتا ہے، اور وہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔قلبی سکون کی دولت سے بہرہ وری کا یہ لازمی نتیجہ ہے، جس کا منظر مسلم معاشرہ مختلف ادوار میں پیش کر چکا ہے۔

تعمیر سیرت کے کام میں فکر آخرت کا کردار

تعمیر سیرت کے کام میں فکر آخرت اور اللہ سے ملاقات کے استحضار کو اہم حیثیت حاصل ہے،فکر آخرت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے نتیجہ میں فرد پر دنیا کی عارضی زندگی، اور اس کی راحت کے سامان کے سلسلہ میں سرد مہری کی فضا پیدا ہوجاتی ہے اور وہ دنیا کے تفکرات سے بلند ہوکر، آخرت کی دنیا میں کھوجاتا ہے، اور آخرت کی فکر اسے بے چین کردیتی ہے۔جس فرد پر دوزخ کا کھٹکہ غالب ہو، اللہ کے سامنے کھڑے ہوکر زندگی بھر کے معاملات کے سلسلہ میں جواب دہی کا استحضار قائم ہو، وہ دنیا میں مستغرق ہوکر، دائمی زندگی کی تباہی کے خطرات کو مول لینے کا متحمل ہرگز نہیں ہوسکتا۔

وَمَنْ أَرَادَ الآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورا.

(جس نے آخرت کا ارادہ کیا (یعنی آخرت کی زندگی کو فیصلہ کن اہمیت دی) اور اس کے لئے جدوجہد کا حق ادا کیا اور وہ صاحب ایمان بھی ہے تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کی جدوجہد قابل قبول ہوگی)۔

اللہ سے ملاقات کے دھیان کا غلبہ ایسی چیز ہے، جو فرد پر سے دنیا کی ہیبت، اس کی مرعوبیت، اس کی بہت زیادہ فکرمندی وحساسیت کو ختم کردیتا ہے اور خواہشات کے سلسلہ میں اس کے احساسات کو سرد مہر کردیتا ہے۔اس طرح سیرت وکردار میں ازخود پاکیزگی کی صورت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور فرد، آداب انسانیت کا نمونہ بن جاتا ہے۔لیکن آخرت کی زندگی کا یقین اور اس کا غلبہ پیدا ہونا مشقت طلب کام ہے جو ذکر وفکر کے مجاہدوں کا متقاضی ہے۔

تعمیر سیرت کا کام ایسا ہے، جس کا سارا تعلق پاکیزہ نصب العین کو ہدف بنانے سے وابستہ ہے۔ جب کسی قوم کے تعلیمی وتربیتی نظام میں یہ ہدف کسی بھی حد تک شامل نہیں ہوتا تو ایسی قوم دراصل منتشر مزاج اور ناپاکیزہ اہداف کی حامل ہوجاتی ہے اور اس کی اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ انتشار وخلفشار سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نیز وہ قوم ہمہ جہتی بحران سے دوچار ہوجاتی ہے۔

قوموں کے لئے نصب العین ان کے لئے موت وزندگی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نکتہ کو نہ سمجھنے والی قومیں موت کے سے حالات سے دوچار ہوجاتی ہیں اور ان پر غلط نصب العین کی حامل قومیں غالب ہوجاتی ہیں۔

اس دور میں مادہ پرست قوموں کو بھی نصب العین کی اہمیت کا پوری طرح ادراک حاصل ہے،لیکن ان کا نصب العین قوم کی مادی زندگی کی بہتری وترقی اور مادی نوعیت کی فلاح ہے،اس مقصد کے لئے بہتر عدلیہ، قانون ساز اداروں کا استحکام، پارلیمنٹ، بہتر انتظامی ڈھانچہ،تعلیمی نظام میں قومی اخلاق کی تعمیراور کاروباری نوعیت کا اخلاق جیسی چیزیں شامل ہیں۔ یہ ناقص نصب العین ہونے کے باوجود وہ اپنی اجتماعی زندگی میں کسی نہ کسی حدتک اس نصب العین کے فوائد وثمرات حاصل کررہی ہیں جب کہ ہمارے یہاں صورتحال مختلف ہے کہ پاکیزہ نصب العین موجود ہونے کے باوجود اسے اختیار کرنے سے انکار کی روش غالب ہے۔

تعمیر سیرت کے بحران میں عشق کی آگ کے بجھ جانے کا کردار

اس دور میں امت میں تعمیر سیرت کا جو ہمہ جہتی بحران پیدا ہوا ہے،وہ اپنے تہذیبی ورثہ سے دوری بلکہ اس سے بڑی حد تک دستکش ہونے کا نتیجہ ہے۔ ہمارے تہذیبی ورثہ کا سب سے بڑا سرمایہ (جسے سرمایہ حیات کہنا صحیح ہوگا) وہ اللہ سے والہانہ محبت کا داعیہ ہے اور یہی محبت فطرت کا طاقتور عنصر ہے، یہ محبت جب اجاگر ہوکر طاقتور ہونے لگتی ہے تو انسانی شخصیت مثبت طاقتور شعاؤں سے جگمگانے لگتی ہے۔ جس طرح بجلی کی شعائیں طاقتور سے طاقتور میشن چلانے کا ذریعہ ہوتی ہیں،

اسی طرح اللہ سے یہ والہانہ اور پاکیزہ محبت جب اپنے عروج کو پہنچتی ہے تو یہ نفسی قوتوں، مادہ پرستی کی طاقتوں اور شیطانی قوتوں کو مات دینے اور انسانی جوہروں سے بہرہ وری کا موجب بنتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکیزہ عشق ومحبت ہی راز حیات ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو انسانی زندگی مردہ لاش کے مثل ہوجاتی ہے کہ آنکھ، کان، زبان اور ہاتھ پاؤں موجود ہونے کے باوجود وہ سننے بولنے، سمجھنے اور تحرک کی صلاحیت سے محروم ہوجاتے ہیں۔

تاریخ میں مسلمانوں نے جب بھی تاریخ ساز کارنامے سرانجام دیئے ہیں، وہ عشق ومحبت کے جوہر کے نتیجہ میں ہی سرانجام دیئے ہیں۔

عشق اپنے ساتھ اللہ کی مدد وقوت کو ہمراہ لاتی ہے۔ عشق داخلی وخارجی ہر طرح کے دشمنوں سے مقابلہ کی صلاحیت رکھتا ہے، عشق انسانی جذبات ومیلانات کو صحیح رخ دینے اور اس کی بے پناہ خفتہ قوتوں کو بیدار کرنے کا موجب ثابت ہوتا ہے۔

جب امت سے پاکیزہ عشق ومحبت کے جذبات رخصت ہوجاتے ہیں، نیز دین ومذہب مراسم بن کر رہ جاتے ہیں تو امت کی وہ حالت ہوجاتی ہے، جو اس وقت ہے کہ کافر قومیں مل کر جگہ جگہ مسلمانوں کا بے دردی سے خون بہا رہی ہیں اور بڑے بڑے مالدار مسلمان ممالک کے حکمران یہ منظر دیکھکر بے حمیتی کا مجسمہ بن گئے ہیں۔

ہماری نظر میں امت میں نشاۃ ثانیہ کی صورت ایک ہی ہے کہ افراد امت میں عشق کی آگ کو دوبارہ بڑھکانے کی صورت پیدا ہو، تاکہ امت میں خودشناسی کا جوہر پیدا ہو سکے۔

اس کی صورت یہی ہے کہ سب سے پہلے عشق کی اہمیت کا شعور پیدا ہو، عشق فاتح عالم ہے، اس کا درد بیدار ہو اور تعلیم وتربیت کے ذرائع کو اختیار کرکے افراد

امت میں عشق کی لہر دوڑانے کی کاوش ہوں۔

تعمیر سیرت، دل کے تالے کو کھولے بغیر نہیں ہوسکتی

تعمیر سیرت کا کام دراصل دل پر لگے ہوئے تالے کو کھول کر اسے اللہ کے ذکر سے منور کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ **اللھم اقفل قلوبنا بذکرک** (یااللہ ہمارے دل کے تالے کو ذکر کے ذریعہ کھول دے) رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہی دعا سکھائی ہے، دل کا تالہ کھلے بغیر پاکیزہ بنیادوں پر تعمیر سیرت کا کام نہیں ہوسکتا، اس صورت میں زبان سے تو اسلام جاری ہوسکتا ہے، لیکن اسلام دل کی آواز نہیں بن سکتی، اس لئے قرآن وسنت اور بزرگان دین نے دل کی صلاحیتوں کی بیداری کی ضرورت پر زیادہ زور دیا ہے۔ دل پر محنت کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا، ایمان کی حقیقت معرفتِ رب حاصل نہیں ہوسکتی۔

دوسروں کی فکر سے زیادہ اپنی فکر کا ہونا

تعمیر سیرت کے حوالے سے یہ نکتہ اہم ہے کہ ابتدا میں دوسروں کی اصلاح کی فکر کو دبا کر، اپنی اصلاح کی فکر کو غالب کرنا پڑتا ہے، دوسری صورت میں افرادِ معاشرہ کی اصلاح کے نام پر فرد کے نفسی جذبات ابھر کر سامنے آنے اور دوسروں کی اصلاح کے نام پر مخاصمت، ضد اور ٹکراؤ کی نفسیات غالب ہوگی، اس طرح دوسروں کی فکر فرد کو اپنی اصلاح سے دور کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں مزید بگاڑ پیدا کرنے کا باعث بنیگی، اس لئے کہ انسانی نفسیات کی پیچیدگیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اپنی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دیئے بغیر وہ ان الجھنوں میں دھستا چلا جاتا ہے۔

اپنا تزکیہ سب سے اہم کام ہے۔ تزکیہ کے بغیر ہونے والے سارے کام خلفشار سے دوچار ہونے لگتے ہیں، بچہ جب تک بولنا نہیں سیکھتا، تب تک خاموش ہی رہتا ہے۔ بولنے کے آداب سیکھے بغیر بولنا اور دوسروں کو دعوت دینا، دعوت کے نام

پر دوسروں کو دور کرنے کے مترادف ہے۔

یہ وہ نکتہ ہے، جسے اہل تصوف (جو انسانی نفسیات کے سب سے بڑے ماہر ہیں) بڑی شدومد سے پیش کرتے رہے ہیں۔

تعمیر سیرت کا ایک اہم تقاضا
تعصب وتنگ نظری سے حفاظت

تعمیر سیرت کا ایک اہمہ تقاضا یہ ہے کہ فرد دین کے نام پر تعصب، تنگ نظری، گروہی وجماعتی تفریق، دوسروں کے اسلام کو مشکوک سمجھنے اور سلف سے ہٹ کر نئے اسلام کو متعارف کرانے اور جہاد کے نام پر تشدد کی روش اور خرخشے پیدا نہ کرے، دین، محبت، رواداری اور دوسروں کے اکرام کی تعلیم دیتا ہے، دین، مشکلات کی بجائے آسانیاں پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دین اپنی شخصیت کو مٹانے اور اپنے آپ کو سب سے حقیر سمجھکر، دعویٰ سے بچنے کی ہدایات دیتا ہے، دین،امت کو امت پن کی حیثیت دینے یعنی وحدت امت پر زور دیتا ہے، دین، جہاد کے نام پر مسلم ریاست اور اس کے اداروں سے تصادم سے روکتا ہے، جب تعمیر سیرت کے کام میں پیش قدمی ہوتی ہے تو شخصیت پر یہ سارے نکات واضح سے واضح تر ہوتے چلے جاتے ہیں، بلکہ یہ باتیں اس کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں۔اس طرح افراد کی تعمیر سیرت کی وجہ سے مسلم معاشرہ خیر وبرکت سے عبارت ہوجاتا ہے۔

جہاں بھی دین کے نام پر گروہ بندی، تعصب اور تشدد کا غلبہ ہوگا، وہاں یہی سمجھا جائے گا کہ افراد میں دین کا ظاہری حصہ تو موجود ہے، لیکن دین کی روح ندارد، یہ سب باطنی بیماریوں کا نتیجہ ہے اور نفس کی کارستانی ہوتی ہے۔نفس کو لگام دینے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، جو محض ظاہری علم سے نہیں ہوتی، بلکہ ذکر وفکر کے مجاہدوں کے ذریعہ نفس کو تزکیہ کے مراحل سے گذارنا ہوتا ہے اور معرفت نفس کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔

تعمیر سیرت کے بحران میں قرآن سے دوری کا عمل دخل

تعمیر سیرت کے ہمہ گیر بحران کا ایک سبب یہ ہے کہ قرآن جو اللہ کی طرف سے انسان کی ہدایت ورہنمائی کی مؤثر ترین کتاب ہے، اس کتاب کو عبرت کی آنکھوں سے پڑھنے اور سننے سے اعراض کی روش غالب ہے۔

قرآن میں اس ساری ہدایت ورہنمائی کا انتظام موجود ہے، جس سے انسان کی زندگی پاکیزگی کا ذریعہ بن سکتی ہے، قرآن میں وہ رقت اور سوزساز موجود ہے کہ وہ فرد کو لرزا دینے اور اس کی زندگی کو بدلنے کے لئے کافی ہے۔قرآن میں ماضی کی قوموں کے نفسانی ونفسیاتی بگاڑ اور اس کے اثرات ونتائج پر تفصیلی بحث موجود ہے، جو دراصل ہماری اپنی نفسانی ونفسیاتی بیماریوں کی نشاندہی کی ایک صورت بھی ہے۔ ماضی کی قوموں کے اخلاقی وروحانی فساد کے حوالے سے ہمیں اپنی نفسی ونفسیاتی خرابیوں کے بارے میں متنبہ کیا گیا ہے۔

قرآن میں آخرت کی ابدی زندگی کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اس زندگی کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ اگر عبرت کی نگاہ موجود ہو تو آخرت کے حوالے سے قرآن میں موجود بحث ہمیں جھنجھوڑ کر، آخرت کی فکر میں مستغرق کرنے کے لئے کافی ہے۔قرآن میں گناہوں کی ہولناک سزا کا جس انداز سے بار بار ذکر موجود ہے، وہ ایسا ہے کہ فرد کے رونگھٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، اس طرح دنیا سے دل لگانے سے بچاؤ کی ازخود صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

قرآن میں دل کی زندگی اور اس کی صلاحیتوں کی بیداری اور اشیائے کائنات میں غور وفکر کی ضرورت پر زیادہ سے زیادہ زور ہے، تاکہ دل کی صلاحیتوں کی بیداری اور غور وفکر کے نتیجہ میں اللہ کے عظیم الشان نظام سے اللہ کی شان عظمت کا احساس غالب ہو۔

قرآن میں اللہ کے ذکر پر زیادہ زور ہے، تاکہ دل اللہ کی خشیت سے سرشار

ہو اور عمل صالح کی قوت میں اضافہ ہو۔

قرآن میں انفرادی واجتماعی معاملات کو بہتر طور پر سرانجام دینے کے لئے اہم بنیادی اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے، تاکہ انسانی زندگی باہمی معاملات کے بگاڑ اور فساد سے بچ سکے۔

قرآن میں عبادت (جس کی معنیٰ معرفت کی گئی ہے) کو انسان کی پیدائش کا مقصد قرار دیا گیا ہے، اللہ کی سچی عبادت سے ایسا انسان وجود میں آتا ہے، جو اللہ کی محبت، معرفت، اس کی خشیت اور تقویٰ سے سرشار ہوتا ہے اور اوصاف حمیدہ کا حامل ہوتا ہے۔

قرآن وہ کتاب ہے، جس میں اللہ بندے (انسان) سے براہ راست مخاطب ہے کہ وہ زندگی کے سفر کو کس طرح خوش اسلوبی سے گزارے اور حالات، مسائل اور مشکلات کا کس طرح مقابلہ کرے، اس اعتبار سے قرآن ایک عطیہ خداوندی ہے، جو انسان کے لئے سرمایۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کی یہ حیثیت بھی مسلمہ ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی طرف بلاتا ہے، اپنے ساتھ محبت کی دعوت دیتا ہے، تاکہ اس کی محبت کے سارے جذبات کی تسکین کی صورت پیدا ہو سکے۔

قرآن اللہ کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے، تاکہ انسان طاغوت اور باطل معبودوں کی اطاعت سے بچ سکے۔

قرآن بُرائی کے خلاف مسلسل جدوجہد اور نیکی کی راہ میں سعیٔ پیہم کی دعوت دیتا ہے، تاکہ انسانی معاشرے کی پاکیزہ بنیادوں پر تشکیل کا کام ہو سکے۔

قرآن جدید مادہ پرست انسان کے اس تصور کو مسترد کرتا ہے کہ چند بھٹکتی ہوئی برہنہ لاشیں ادھر بیابان وجود میں آنکلی ہیں، یہی انسان کی کل حیثیت ہے، قرآن کی روح سے یہ عقیدہ انسان کی حقیقت سے ناآشنائی کا نتیجہ ہے۔ انسان تو

دراصل خالق کی شاہکار تخلیق ہے، حسن مطلق ہستی کے حسن کا مشاہدہ اس کا مقصود ہے، اس جدوجہد میں اپنے وجود اور اپنی ہستی کو فنا کرنے کے نتیجہ میں ہی اسے اس دنیا میں اس کی ایک جھلک نصیب ہو سکتی ہے، اصل مشاہدہ اسے دوسری دنیا (آخرت کی دنیا میں ہی) حاصل ہوگا، جو اس کے لئے ساری سعادتوں سے بڑھکر سعادت ہوگی۔)

قرآن سے دوری یا اسے اہمیت نہ دینے یا اس پر غوروفکر نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ ہماری زندگی قرآن کے پاکیزہ اثرات سے خالی ہے، اور ہم سنگ دلی وقساوت قلبی کا شکار ہیں اور ہماری انفرادی واجتماعی زندگی فساد سے سرشار ہوگئی ہے۔ جب قرآن جیسی پاکیزہ اور مقدس کتاب سے استفادہ کے راستے مسدود ہوجائیں تو پھر بگاڑ سے بچاؤ کی کیا صورت باقی رہ جاتی ہے۔

تعمیر سیرت میں انسان کی حقیقی نوعیت کو سمجھنا ناگزیر ہے

پاکیزہ تہذیب کی بنیاد پر تعمیر سیرت کا کام ہمیشہ مشکل رہا ہے، ماضی میں اس کی سزا کے طور پر قومیں اللہ کے عذاب کا شکار رہی ہیں، اس دور میں تعمیر سیرت کا کام تو سب سے زیادہ دشوار تر ہوگیا ہے۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ اس دور کے مادی نظریات، مادی تہذیب اور تمدن کی مادی سہولتوں اور راحتوں کے سامان نے دل کا اس طرح گھیراؤ کر لیا ہے کہ دل ان چیزوں کا اسیر بن کر رہ گیا ہے۔

اس مادی تہذیب ومادی نظریات کے غلبہ کا ایک دوسرا نقصان جو ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کے بارے میں اس بات کا ادراک سلب ہوگیا ہے کہ وہ مادہ کے ساتھ روح کی لطافتوں کا مرکب ہے۔ وہ ظاہر وباطن دونوں سے عبارت ہے، وہ قال وحال دونوں کا صاحب ہے، وہ عقل اور دل دونوں قوتوں کا مجموعہ ہے، وہ علم کے ساتھ معرفت کا حامل ہے، ظاہر وباطن کے اس مرکب کو نہ سمجھنے، بلکہ اس کے انکار کی روش کی وجہ سے پوری انسانیت خطرات سے دوچار ہے۔ جس طرح سمندر

محض ظاہر سے عبارت نہیں ہے، بلکہ سمندر کا زیرین حصہ اس کے ظاہر سے ہزار گنا زیادہ گہرا ہے اور اس میں موتی وجواہر اور قیمتی سے قیمتی چیزیں موجود ہیں، بالکل اسی طرح انسان محض ظاہری جسم اور جسمانی نظام ہی سے عبارت نہیں ہے، بلکہ اس کی باطنی دنیا، ظاہری دنیا سے ہزار گنا زیادہ وسیع ہے، اس باطن میں بڑے بڑے بت کدے بھی موجود ہیں تو ساتھ ساتھ ملکوتی قوتیں بھی ہیں اور فطرت سلیمہ کے طاقتور اجزاء بھی موجود ہیں۔ باطن میں محبوب حقیقی کے حیرت انگیز کرشمے اور اس کے مناظر ومظاہر بھی موجود ہیں۔

بدقسمتی سے مادی تہذیب کے غلبہ کے نتیجہ میں باطن کی اس وسیع تر دنیا سے انکار کی روش کی وجہ سے انسان کی زندگی ترقی یافتہ حیوان کی زندگی سے عبارت ہوگئی ہے، جس کے پیش نظر کھانا، پینا، سونا، کام کرنا اور مرجانا ہی اصل مقصود ہے۔

باطن میں موجود حیوانی ونفسانی جذبات کو پامال کرنے اور فطرت سلیمہ میں موجود پاکیزہ جذبات کو بیدار کرکے، انہیں طاقتور تر بنانے سے ہی انسانیت کی ساری انسانیت وابستہ ہے اور سیرت کی پاکیزہ بنیادوں پر تعمیر کا سارا کام اسی سے وابستہ ہے۔

جب تک فرد وافراد قال سے حال کی طرف نہیں آتے، مادہ پر روح وروحانی قوتوں کو غالب نہیں کرتے، عقل وعقلیت سے دل کی پاکیزہ صلاحیتوں کی بیداری اور اس کی ارتقا کی طرف نہیں آتے، محبت ومعرفت کے جوہروں سے نفسی قوتوں کو شکست نہیں دیتے، تب تک انسانیت، حیوانوں بلکہ درندوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑنے اور اللہ کی زمین کو فساد سے بچانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی، اور اللہ کی زمین پر انسان کی طرح زندگی گذارنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور نہیں ہوسکتی۔

مادی تہذیب کے علمبرداروں نے انسانیت پر حیوانیت کو مسلط کرکے، اسے ہولناک فساد سے دوچار کردیا ہے۔ اس سے نکلنے کی صورت یہی ہے کہ انسان کی

حقیقی نوعیت کو سمجھا جائے، اس طرح معرفت ذات سے معرفت رب تک رسائی حاصل کی جائے، یعنی خودشناسی سے خدا شناسی تک پہنچا جائے۔

قرآن میں ہے **وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ** . (ہم تم سے تمہاری رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں) **وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ**. (ہماری نشانیاں تمہارے اندر موجود ہیں۔ آخر تم دیکھتے کیوں نہیں ہو) **وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ** . (تم جہاں کہیں بھی ہو ہم تمہارے ساتھ ہیں) انسان کی ظاہری مادی وجسمانی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنے اور اس مادی زندگی کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے اپنی ساری توانائیاں خرچ کرنا، یہ سب سے بڑی نادانی ہے، جس سے بڑھکر دوسری کوئی نادانی ہو نہیں سکتی، اس کا لازمی نتیجہ اپنے خالق کی فراموشی کی صورت میں ہی ظاہر ہوسکتا ہے۔ اپنے مولا، اپنے آقا، اپنے خالق اور اپنی سب سے بڑی محسن ہستی کو فراموش کرنے کی جو سزا مل سکتی ہے، وہ یہی سزا ہے کہ انسان، انسان کا دشمن بن گیا ہے۔ وہ مادی مفادات کی خاطر درندوں کی طرح ایک دوسرے کو مارنے اور ذبح کرنے کے لئے تیار ہے۔ سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کی ضرورت ہے۔

تعمیر شخصیت میں مراقبۂ موت کا کردار

تعمیر شخصیت کے کام کے لئے موت کا دھیان اور اس کا استحضار سب سے مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ لذتوں کو توڑنے والی چیز یعنی موت کو یاد کیا کرو، حقیقت یہ ہے کہ موت کے دھیان کے غلبہ کا یہ نسخہ ایسا اہم ہے کہ دل، دنیا کے حوالے سے سرد ہونے لگتا ہے، دنیا کی محبت اور حب جاہ جیسے جتنے بھی فساد شخصیت میں پیدا ہوتے ہیں، ان کی اصلاح کا یہ کارگر ترین نسخہ ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اسے مراقبہ موت کہتے ہیں۔

مراقبہ موت سے جب موت کا منظر، قبر کا منظر، حشر کا منظر، دنیا کے فانی ہونے کا منظر غالب ہونے لگتا ہے کہ دنیا کی زندگی کو خوبصورت اور بہتر سے بہتر

بنانے کے اس کے سارے جذبات واحساسات ٹھنڈے پڑجاتے ہیں تو موت کی تیاری کی فکر اس کے سارے افکار پر حاوی ہونے لگتی ہے۔

تعمیر شخصیت کے حوالے سے مراقبہ موت کے اتنے فوائد وثمرات ہیں، جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتے، وہ صرف حال سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن مراقبہ موت میں کچھ خطرات بھی پوشیدہ ہیں کہ دنیا کی زندگی اور معاملات کے حوالے سے کہیں فرد بالکل جمود وتعطل کا شکار نہ ہوجائے۔ اس لئے مراقبہ موت کسی کامل شیخ کی سرپرستی میں ہونا بہتر ہے۔

اخوان المسلمون کے بانی حسن البناء کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی قبر تیار کر لی تھی اور روزانہ اس میں کچھ دیر کے لئے لیٹ جاتے تھے، تاکہ قبر کی یاد تازہ ہوتی رہے۔ یہ دراصل ''مراقبہ موت'' کی آخری عملی صورت تھی۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا کہ لذتوں کو توڑنے والی موت کو یاد کیا کرو، یہ موت کی تیاری کے استحضار کو قائم رکھنے کا بہترین نسخہ ہے۔

سلف صالحین کی فکر سے بھرپور استفادہ کے بغیر تہذیب نفس کا نہ ہونا

تعمیر سیرت (جسے تہذیب نفس بھی کہہ سکتے ہیں) اس کے لئے سلف صالحین کی پیش کردہ اسلامی فکر پر اعتماد کا ہونا ضروری ہے۔ نیز اسلام کے بنیادی معاملات میں ان کی تشریح وتعبیر پر یقین لازم ہے، اس سلسلہ میں کسی جدید مفکر، جدید مجتہد یا کسی جدید عالم کی فکر کی تقلید سے احتیاط ناگزیر ہے، اس لئے کہ جدید مفکر یا جدید مجتہد شخصیت جو سلف صالحین کے فکر سے بھرپور استفادہ کی حامل نہ ہو، اس کی اسلامی فکر جدیدیت یا عقلیتِ محض کے اثرات سے آزاد ہوکر، صحیح اسلامی نصب العینی فکر کی ترجمان ہو، محال ہے۔

سلف صالحین کی اسلامی فکر کا ہدف تعلق مع اللہ، اللہ سے والہانہ محبت، فکر آخرت، اپنی ذات پر اسلامی شریعت کے نفاذ کی جدوجہد، سیرت وکردار میں

پاکیزگی، اسلامی جوہروں سے بہرہ وری، ذکر وفکر وعبادت میں مداومت، فرائض وواجبات کی سختی سے پابندی، اپنی صلاحیتوں کے تحت دعوتی کام اور حمیت دین کے مظاہرے اور دعوتی کام جیسی چیزیں شامل ہیں۔ یہی وہ اہم چیزیں ہیں، جس سے تعمیر سیرت اور تہذیب نفس کے ارتقائی مراحل طے ہوتے ہیں اور فرد وافراد کی شخصیت میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، جب کہ جدید مفکروں اور مجتہدوں کے یہاں دین کی ساری ترتیب سلف کی دین کی ترتیب سے بالکل جداگانہ ہے۔ جس میں خارجی زندگی میں جدوجہد کے کام کو دین کے نصب العینی کام کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور دین کے مذکورہ نصب العینی اہداف کو ثانوی بلکہ ذیلی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

چنانچہ اس طرح کی فکر سے تعمیر سیرت اور تہذیب نفس کا کام نہیں ہوسکتا، تہذیب نفس کے لئے نفسی قوتوں کو عرصہ تک آتش عشق میں جلا کر، اس کی درندگی وحیوانیت کو مضمحل کرنا پڑتا ہے۔

جدید اسلامی فکر چونکہ سلف صالحین کی فکر میں غوطہ زنی سے تہی دامن ہے، اس لئے اس فکر سے حقیقی تعمیر سیرت اور تہذیب نفس کی نہ صرف یہ کہ صورت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس فکر سے دوسرے اہداف، دین کے مقصود کی حیثیت سے سامنے آکر فرد وافراد کو قرآن وسنت کے سلف کے متعین شدہ اہداف سے بہت دور کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس لئے فرد وافراد کی دین کی سلامتی اور اس کی تہذیب نفس کے سارے کام کا تعلق اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ آنکھیں بند کرکے، سلف کی دین کی پیش کردہ تعبیر وتشریح وترتیب پر اعتماد کریں۔

بعض اسلامی مفکروں کے کام کے مثبت پہلوؤں کی قدر ضروری ہے

دور جدید کے بعض اسلامی مفکروں نے تعمیر سیرت کے سلسلہ میں تو فیصلہ کن کردار ادا نہیں کیا، لیکن انہوں نے جدید الحادی نظریات کے خلاف بند باندھنے اور

جدید طبقات کو اسلام پر اعتقادی اور نظریاتی طور پر مطمئن کرنے اور انہیں اسلام کے دفاع کے محاذ پر کھڑا کرنے کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جدیدیت کا تیز سیلاب اور الحادی نظریات کا خوفناک چیلنج ایسا تھا، جس کے مقابلہ کے سلسلہ میں علمائے کرام کردار ادا کرنے سے قاصر تھے، اس لئے کہ ان کے لئے جدیدیت کے وسیع تجزیاتی مطالعہ کی ضرورت تھی، جدید مفکروں نے پچھلے ایک سو سال میں اس چیلنج کا مؤثر جواب دیا اور اپنی طاقتور فکر کے ذریعہ جدیدیت کی شکار ہمارے ہزاروں لاکھوں باصلاحیت وذہین افراد کو اس سیلاب سے نکال کر، اسلام کی سرحد میں داخل کرنے میں کامیاب ہوئے، ان مفکرین کا یہ کام ایسا ہے، جس کا اعتراف وتحسین کرنا ضروری ہے۔

چونکہ ہمارے علمائے کرام عمومی طور پر جدیدیت کے خوفناک نظریاتی چیلنج کے ادراک سے قاصر ہیں، انہیں یہ معلوم نہیں کہ مغرب کی ملحدانہ فکر کے مطالعہ کی وجہ سے ہماری جدید نسلیں کس طرح نسلی طور پر مسلمان ہونے کے باوجود عملی طور پر ارتداد کی زبردست تحریک کا شکار ہیں، ان حالات میں بعض جدید اسلامی مفکروں کا کام اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ انہوں نے عالم اسلام میں ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں جدید تعلیم یافتہ افراد کا اسلامی نظریہ پر اعتقاد واعتماد کو بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اپنی اسلامی فکر کے ذریعہ کسی حد تک ان کی تربیت کا کام بھی کیا، اگرچہ ان مفکروں سے دین کی ترتیب میں فاش غلطیاں بھی ہوئیں، تاہم ان کے اس مثبت کام کا اعتراف اور اس کی قدر کرنا ضروری ہے۔

نئی تشریح اسلام کے کچھ نتائج ومضرات

جو فرد علمائے ربانی کی زیر صحبت اور ذکر وفکر کے مجاہدوں اور نفس کے مکر وفریب کے مشاہداتی مراحل سے نہیں گذرے گا، اسے دین کے حقائق ومعارف کا صحیح ادراک حاصل نہ ہوسکے گا۔ اسے محض علم، ذہانت، ذاتی مطالعہ اور لغت کی مدد

سے قرآن وسنت کے حقیقی فہم وترتیب اور اس کے مقصد اور پیغام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہو سکے، محال ہے۔

دین کی صحیح ترتیب، اس کے صحیح اہداف اور اس کے مقاصد کو سمجھنے کے لئے بزرگوں کی علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ نفسی قوتوں کے ذاتی مشاہداتی مراحل سے گذر کر، دل کی گہرائیوں تک پہنچنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر علم کے نام پر دین کی ایسی تشریح ہوگی، جس سے فرد وافراد، اصلاح نفس کے کام سے دور تر ہوتے جائیں گے اور وہ دین کے نام پر خارجی نوعیت کے کاموں کو فیصلہ کن اہمیت دیں گے، چونکہ نفس کے ہولناک فتنوں اور اس کے مکر وفریب کی ہزارہا وارادتوں سے آشنائی نہ ہوگی، اس لئے دین کی ایسی تشریح فرد وافراد کو ایک تو سلف کی تشریح اسلام سے دور تر کردے گی۔ دوم یہ کہ ایسے افراد سکون قلبی کی دولت سے بے بہرہ ہوں گے۔ سوم یہ کہ حقیقی اخلاقی وروحانی قوت سے بہرہ ور نہ ہونے کی وجہ سے ان کے باہمی تعلقات میں خوشگواری پیدا نہ سکے گی اور رواداری ومحبت کی صورت پیدا نہ ہو سکے گی۔

چہارم۔ یہ کہ اس طرح کی تشریحِ اسلام سے امت میں نئے نئے گروہ سامنے آتے ہیں۔

تعمیر سیرت کے کام کے متاثر ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ اسلام کی خود ساختہ تشریح کی کوششیں عرصہ سے ہورہی ہیں، دین کی ایسی تشریح جو سلف سے بے نیاز ہوکر، خودرائی کی بنیاد پر ہو اور قرآن کو اپنی ذاتی رائے اور ذہانت کی مدد سے سمجھنے کے ذریعہ ہو، اس کے یہ کتنے بڑے نقصانات ہیں، جو امت کو بھگتنے پڑتے ہیں۔

اس وقت معاشرے میں ایسے کئی جدید اہل علم ہیں، جو خودرائی کے ذریعہ اسلام کی نئی تشریح اور نئی اسلامی فکر پیش کررہے ہیں۔ ان کی تنقید کا سب سے بڑا

نشانہ صوفیائے کرام اور علمائے کرام ہیں، اس لئے کہ ان کی اسلام کی نئی تشریح کی راہ میں علمائے کرام ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

اس تشریحِ اسلام کا ایک بڑا نقصان جو سامنے آیا ہے، وہ یہ ہے کہ دعوی اور بڑے بڑے کاغذی منصوبہ بندی پر بہت زیادہ زور ہے، پورے ملک کو مفتوح کرنے اور اسلام سے ہمہ آہنگ بنانے کی باتیں ہیں، لیکن کردار میں مسکین سے مسکین تر ہونا اور باہمی محبت کے معاملہ میں کمزور سے کمزور تر ہونا، اسلام کو نشر و اشاعت اور اخبارات سے جاری وساری کرنے میں زیادہ سے زیادہ کوششوں کا ہونا، لیکن اپنی ذات پر اسلام کو نافذ کرنے کے کام میں کوتاہ واقع ہونا، چونکہ یہ کام اپنے آپ کو اندر سے تبدیل کرکے، تزکیہ کے لئے مجاہدوں سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے یہ مشکل کام نہیں کرنا، لیکن بیانات، تقاریر اور اخبارات سے نفاذ اسلام کا کام چونکہ سب سے آسان ہے، اس لئے اسی کو ہدف بنانا ہے۔

علمائے کرام کے بارے میں اعتراضات کی نفسیات اور اس کے منفی اثرات

علمائے کرام جو قال اللہ وقال الرسول کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، مسجد ومدرسہ کا محاذ سنبھالے ہوئے ہیں اور لاکھوں سے زیادہ افراد کی دینی تعلیم کا کام کررہے ہیں، اور یہ سارا کام وہ مسکینی کی حالت میں کررہے ہیں۔ ان علمائے کرام پر اعتراضات کی نفسیات کا پیدا ہونا اور انہیں بے جا تنقید کا نشانہ بناتے رہنا اور ان پر شعوری یا غیرشعوری طور پر اعتماد کو مجروح کرنے کے لئے کوشاں ہونا، یہ روش بھی ایسی ہے جو تعمیر سیرت میں رکاوٹ کا موجب بن جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک تو وہ طبقہ ہے، جس کی جدید اسلامی فکر کی بنیاد پر تربیت ہوئی ہے، وہ علمائے کرام کو نہ صرف یہ کہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں، بلکہ وہ اپنی گفتگو میں انہیں نشانہ تنقید بناتے رہتے ہیں، دوسرا وہ طبقہ ہے جو جدیدیت کے

اسلامی ایڈیشن کی تیاری کے کام میں مصروف ہے۔

اس طبقہ کا بھی سب سے زیادہ نشانہ علمائے کرام ہی ہیں۔ اس لئے کہ جدید اسلامی ایڈیشن کی تیاری کی راہ میں علمائے کرام ہی حائل ہیں۔

تیسرا وہ طبقہ ہے جو پاکستان کی اسلامی نظریاتی بنیادوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے، وہ عالمی شاہوکار کے ایجنڈا پر کام کررہا ہے اور یہ طبقہ میڈیا پر قابض ہے، اس کا سب سے بڑا ہدف علمائے کرام اور دینی مدارس ہی ہیں۔ اس لئے کہ ملک میں اسلام کے لئے عوام سے رابطہ اور ان کی دینی تربیت کا سارا کام علمائے کرام ہی کررہے ہیں۔

علمائے کرام کی بعض کمزوریوں کے باوجود وہ ہمارے لئے ہر اعتبار سے قابل احترام ہیں اور وہ محبت کے مستحق ہیں، ان سے کدورت، ان کی تحقیر اور ان پر اعتراضات کی نفسیات وغیرہ یہ ساری ایسی چیزیں ایسی ہیں، جس سے زندگی سے خیروبرکت رخصت ہوجانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

خاص طور پر جدید اسلامی طبقات کو یہ نکتہ سمجھنا چاہئے، دین کے وارث علمائے کرام ہی ہیں، ان سے محبت دین ہی سے محبت کے مترادف ہے۔ ایسا کرنے سے ہی تعمیر سیرت کے کام میں آسانی پیدا ہوگی۔

اسلام کے لئے سازگار ماحول اور حکومت کی ضرورت

تبلیغی جماعت کی یہ بات بہت اہم ہے کہ جب تک گھر کا ماحول اور بازار کا ماحول اسلام سے ہمہ آہنگ نہ ہوگا، اس وقت تک معاشرہ میں نیکی اور خیر کو فروغ حاصل نہ ہوسکے گا اور معاشرہ کی اسلامی خطوط پر بدلنے کی صورت پیدا نہ ہوگی۔

جس معاشرہ میں خیر کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو اور بُرائی جس معاشرہ کے اجتماعی مزاج کا حصہ بن چکی ہو، دنیا کی راحت کا سامان جس کی زندگی کا ہدف

بن چکا ہو، اس معاشرہ میں خیر کو فروغ حاصل ہو، محال تر ہے، اس لئے معاشرہ کو بدلنے کی جدوجہد کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن معاشرہ کو بدلنے کی جدوجہد انہی صاحب ایمان افراد کا کام ہے، جو خود نفس پرست اور مادہ پرست معاشرہ سے متاثر ہونے کے لئے تیار نہ ہوں، اور جن کا اللہ سے محبت کا تعلق مستحکم ہو، جو بُرائی کے وسوسوں کے آنے تک سے چوکنا ہوتے ہوں اس طرح کے صاحب ایمان افراد کے وجود اور ان کی کوششوں سے ہی معاشرہ میں تبدیلی کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں۔

بعض اسلامی مفکروں کی یہ بات بھی اہم ہے کہ جب تک ریاستی نظام میں تبدیلی واقع نہ ہوگی اور تعلیم ، میڈیا اور سیاسی ادارے اسلام سے ہمہ آہنگ نہ ہوں گے اور اسلامی حکومت قائم نہ ہوگی، تب تک معاشرہ کی سطح پر نیکی کے لئے ہونے والی کوششیں بارآور ثابت نہ ہوسکیں گی، اس لئے کہ حکومت کی سرپرستی میں ہونے والی بدی وشر کو روکنا دوچار فیصد نیک افراد کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہ نقطہ نگاہ بھی صحیح ہے، لیکن نظام کی تبدیلی کے لئے کام کرنے والے افراد ایسے ہوں، جن کی ذاتی زندگی اسلام سے پوری طرح ہمہ آہنگ ہو اور جو روحانی وباطنی طور پر مستحکم ہوں اور جو اللہ سے مستحکم تعلق کے حامل ہوں، جن کے دل ایمان سے سرشار ہوں، جو تبدیلیٔ حکومت کی جدوجہد کے دوران حب جاہ وحب مال، جذبۂ نام نمود جیسی بُرائیوں سے قابل ذکر حد تک محفوظ ہوں، دوسری صورت میں تبدیلیٔ حکومت کی یہ جدوجہد افراد کے لئے ابتلا وآزمائش کا ذریعہ بن جائے گی اور شخصیت کی تعمیر اور سیرت وکردار کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی۔

ہم معاشرے اور ریاست کی تبدیلی دونوں قسم کے کاموں کی اہمیت کے قائل ہیں اور ان دونوں کاموں کو ملت کی بقا کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، لیکن اس کے لئے جس قسم کے افراد مطلوب ہیں، وہ باطن کی تعمیر اور نفس پرستی کی قوتوں سے معرکہ آرائی کے مراحل سے کسی حد تک گزرے ہوئے افراد ہی موزون ہو سکتے ہیں،

دوسری صورت میں نفسی قوتوں اور باطنی امراض کی موجودگی میں معاشرے وریاست کی تبدیلی کے کام میں نہ صرف یہ کہ قابل ذکر پیش قدمی نہ ہو سکے گی، بلکہ اس کام کے ذریعہ وہ سیرت وکردار کے بحران کے خطرہ دوچار ہوں گے اس لئے کہ نفس کی وسیع دنیا ایسی ہے جہاں خونخوار درندے رہتے ہیں، ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں کے ذریعہ ان درندوں کا مقابلہ کئے بغیر عملی اجتماعی کام سے یہ درندے حملہ آور ہوتے ہیں اور فرد وافراد کے ایمان کے ضیاع کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ہماری اس گفتگو کا حاصل یہ ہے معاشرے کی تبدیلی کا کام ہو یا ریاست کی تبدیلی کام، ان دونوں نوعیت کے کاموں سے پہلے دل کی تبدیلی کا کام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اس لئے کہ دل بدلے گی تو دونوں نوعیت کے کاموں میں اخلاص، للھیت وبےنفسی پیدا ہوگی، اس اخلاص سے ایک تو اجتماعی جدوجہد ہر طرح کے فساد وانتشار اور کارکنوں کے باہمی تصادم سے محفوظ ہوگی دوم یہ کہ اخلاص سے ہونے والے کام میں ہی اللہ کی مدد ونصرت کی بہتر سے بہتر صورت پیدا ہوتی جائے گی۔

مذہبی افراد کو ایک دوسرے سے بدگمانی سے بچانے کے کام کی اہمیت

تعمیر سیرت کے حوالے سے اس دور کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اہل علم، اہل دانش اور مذہبی افراد کو ایک دوسرے سے بدگمانی، بے جا تنقید، بلکہ دوسروں کی تحقیر وتردید اور کھینچا تانی سے کیسے بچایا جائے؟ یہ ایسی روش ہے، جس نے معاشرہ کو شدید گروہ بندی اور تفریق میں مبتلا کردیا ہے، جب کہ دجالی تہذیب کے علمبردار تیزی سے ہمارے معاشرے میں نفوذ حاصل کرتے جارہے ہیں اور وہ ہمارے ہی لاکھوں ذہین وباصلاحیت افراد کو خرید کر، ہماری تہذیب کے خلاف استعمال کررہے ہیں اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے مسائل پر متصادم ہیں اور ملی وحدت پر ضرب کاری لگانے کا موجب بن رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب علم، قال سے حال کی صورت اختیار نہیں کرتا اور اللہ کی محبت کے اجزاء سے بہرہ وری اور معرفت کے ذریعہ نفسی قوتیں ایک حد تک مطیع نہیں ہوتی تو شخصیت، خواہشات کے غلبہ کے زیر اثر ہوتی ہے، اس وقت اہل علم، اہل دانش اور مذہبی افراد سے اسی طرح کا کردار سامنے آتا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ.

(یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، ان سے کہو کہ تم ابھی ایمان نہیں لائے بلکہ تم نے اسلام کو قبول کیا ہے۔ اور ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا)۔

ایمان جب دل کی گہرائیوں میں داخل ہوتا ہے تو ایمان کے منافی ساری چیزوں سے بچاؤ کی ازخود صورت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایمان کے استحکام کے لئے ذکر وفکر کے مجاہدوں اور تزکیہ کی ضرورت ہے، شخصیت میں ایمانی اعتبار سے استحکام کی صورت یہی ہے۔ دوسری صورت میں فرد محض علم، ذہانت اور ظاہری مذہبی مراسم سے باطنی بیماریوں سے بچ سکے، محال ہے۔

ہماری نسلوں کی قابل رحم حالت اور انہیں بچانے کے لئے فکرمندی کی ضرورت

ہماری وہ نسلیں جو پچھلے بیس سال سے الیکٹرانک میڈیا کے زیر اثر پروان چڑھی ہیں، وہ اس اعتبار سے قابل رحم ہیں کہ وہ اپنی پاکیزہ تہذیب کے ادراک کے ذرائع واسباب سے محروم ہیں، اسلامی لٹریچر سے ان کا تعلق ختم ہو چکا ہے۔ اپنے تاریخی وتہذیبی ورثہ سے ان کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ مادہ پرست عالمی تہذیب کی یلغار کا شکار ہو چکے ہیں اور اپنی پاکیزہ تہذیب سے وابستگی اور اس تہذیب کی معلومات کے سارے ذرائع سے وہ بہت دور جا چکے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی مثال گونگوں، بہروں اور اندھوں کی سی ہوگئی ہے کہ اپنی پاکیزہ تہذیب کے حوالے سے ہونے والی گفتگو کے وقت ان کے دل منقبض اور بے چین

ہوتے ہیں اور مادی تہذیب اور اس کی تیز رفتار ترقیوں کی گفتگو ہوتے ہی ان کے چہرے کھل اٹھتے ہیں۔

ہماری نسلوں کی یہ حالت زار ایسی ہے، جو ماتم کرنے کے قابل ہے۔ ابھی دجال کا ظہور نہیں ہوا، دجالی تہذیب کے غلبہ کے وقت یہ حالت ہے تو ظہور دجال کے وقت جو صورتحال پیدا ہوگی اور جس تیزی سے ایمان رخصت ہوتا جائے گا، وہ قیامت خیز منظر سے کم نہ ہوگا۔

ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں نئی نسلوں کے دین وایمان کو بچانے کے سلسلہ میں جو بھی کردار ادا ہوسکتا ہے، وہ ادا کیا جائے۔

اس ضمن میں ضروری ہے کہ پرانے مسلکی وکلامی اختلافات سے بلند ہوکر، ملت کی زندگی اور موت کے ان مسائل کو سمجھا جائے اور انہیں فیصلہ کن اہمیت دی جائے اور نئی نسل سے وابستہ افراد سے رابطے اور تعلقات کی صورتیں پیدا ہونے کی کوششیں ہوں۔

مسلمان حکمرانوں کا المیہ

اس وقت مسلمان حکمرانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی تہذیب کی بنیادوں پر تعمیر سیرت کے کام سے آخری حد تک غافل ہیں، جس کا نتیجہ ہے کہ امت کے مسائل کے سلسلہ میں وہ بے حسی وبے حمیتی کا نمونہ بن گئے ہیں، امت کے وسائل سے عیش وعشرت کرنا، ان کا وتیرہ بن چکا ہے، وہ دشمن کے سامنے بھیگی بلی بن چکے ہیں۔ امت ہر جگہ مر رہی ہے، دشمن کے ہاتھوں پٹ رہی ہے، ان کا خون بہایا جارہا ہے۔ ان کی لاشوں کا مثلہ بنایا جارہا ہے، افغانستان میں، روہنگیا میں، شام میں کشمیر میں، فلسطین میں ہر جگہ انہیں جانوروں کی طرح ذبح کیا جارہا ہے، لیکن مسلمان حکمران نہ صرف آرام کی نیند سو رہے ہیں، بلکہ ان کی نظر میں امت کے یہ مسائل اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان پر غور وفکر کیا جائے اور اپنی اجتماعی قوت کے

ذریعہ ان مسائل کے حل کی صورت نکالی جائے۔

پچھلے دنوں ایک اسلامی ملک کے سربراہ نے کفر کی عالمی قوت کے سربراہ کو ایک ارب ڈالر کے (ذاتی طور پر) تحفے عطا کئے اور اربوں ڈالر کے اسلحہ کا معاہدہ کیا، لیکن یہ حکمران روہنگیا کے مظلوم مسلمان جو موت کے سے حالات سے دوچار ہیں، ان کی مدد کے لئے ان کے پاس کچھ زیادہ رقم موجود نہیں۔

مسلمان حکمرانوں کی یہ بے حسی و بے حمیتی ایسی ہے، جو ایک تو دشمن کو امت کو لقمہ تر سمجھکر، اسے نگلنے پر اکسانے کا ذریعہ بن رہی ہے، دوم یہ کہ یہ روش اللہ کے شدید عتاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جب امت کے وسائل امت کی بجائے دشمن کو مزید مستحکم کرنے کے لئے خرچ ہورہے ہوں (جس طرح مسلمان حکمرانوں کے کربہا ڈالر دشمن ملکوں کی بنکوں میں بڑے ہوئے ہیں) تو اس سے بڑھکر المیہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

قوموں کی زندگی اور موت وحیات کا اپنی تہذیب سے وابستہ ہونا

قوموں کا کردار ان کی تہذیب کی بنیاد پر بنتا ہے، اس لئے قومیں اپنی تہذیب سے دوری وبغاوت کی ہرگز متحمل نہیں ہوتی، مغربی قوموں کی تہذیب مادہ پرستی پر مبنی سرمایہ دار نظام سے وابستہ ہے، اس تہذیب نے ہی ان کے قومی کردار کی تعمیر کی ہے، جس کے تحت قومی مفادات کو اولیت حاصل ہوگی، اجتماعی نظام کی تشکیل سیکولرزم کی بنیاد پر ہوگی، کھانا پینا، عیش وعشرت کرنا زندگی کے مقاصد میں شامل ہوگا۔ ہر ایسا کردار، جس سے قوم کے مفادات مجروح ہوں گے، قابل سزا ہوں گے، مغربی تہذیب کی طرح اسلامی تہذیب بھی ایک بالکل جداگانہ تہذیب ہے، جو قوم سے ایک پاکیزہ کردار کی متقاضی ہے۔ لیکن کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہماری سیاست، معیشت، معاشرت اور اجتماعی زندگی ہمارے تہذیبی نشانات اور اس کی بنیادوں سے بالکل خالی ہے۔

اس اعتبار سے ہماری حالت مغربی قوموں سے بھی بدتر ہے، اس لئے کہ ان کے ہاں اپنی مادی تہذیبی قدروں کی بنیاد پر کردار کی تعمیر وتشکیل ہوتی ہے، اگرچہ ہمارے نقطہ نگاہ سے اس میں بہت ساری بنیادی کمزوریاں موجود ہیں، لیکن ہماری اجتماعی زندگی میں تو اپنی تہذیب کی سرے سے کوئی نمود ہی موجود نہیں۔ ہم بنیادی انسانی اخلاقیات سے بھی عاری ہوتے جارہے ہیں، ہمارے یہاں احتساب کا نظام لگ بھگ ختم ہے، عدل وانصاف کا تصور ناپید ہے۔ کاروباری معاملات، اخلاقیات سے عاری ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں حتیٰ کہ دواؤں تک میں ملاوٹ شامل ہے، جھوٹ، ملاوٹ، رشوت، ذخیرہ اندوزی اور دھوکہ دہی سے مال کھانے کی روش عام ہے، قومی خزانہ کی لوٹ مار کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ بڑی سطح کے سرکاری افسران عام طور پر ہر طرح کی بدعنوانیوں میں ملوث ہیں۔

ملی تہذیب کے منافی اس روش کے ساتھ ملت کی زندگی خطرے سے دوچار ہوئے بغیر رہ سکے، ممکن ہی نہیں ہے۔ اس سے بڑھکر دوسرا المیہ یہ ہے کہ ہمارے بااختیار اور مؤثر طبقات میں اپنی پاکیزہ تہذیب سے بغاوت کی اس روش کے نتائج اور قومی زندگی کی پاکیزہ تہذیبی بنیادوں پر تشکیل کا سرے سے کوئی احساس، فکر اور درد وادراک ہی موجود نہیں ہے۔

دینی ومذہبی طبقات میں اس کی فکر ودرد تو موجود ہے، لیکن سارے ریاستی ادارے اور ذہن سازی وتعلیم تربیت کے ادارے مادیت پرستی کے جس طوفان کو ابھار رہے ہیں، اس کا مقابلہ کرنا اور نسلوں کی صحتمند خطوط پر تربیت کرنا، ان کے لئے دشوار سے دشوار تر کام ہے۔

ہماری قومی، ملی ودیانتی زندگی اپنی پاکیزہ تہذیب سے بغاوت کی جس روش پر گامزن ہے، اس کا لازمی نتیجہ طاقتور مادہ پرست قوموں کی بدترین غلامی کی صورت میں ہی نکل سکتا ہے۔ غلامی کی یہ صورت بڑی حد تک پیدا ہو چکی ہیں کہ ہماری

ساری پالیساں ان کے متعین کردہ خطوط پر متشکل ہورہی ہے۔ ہم ہر مادی قوت وہ امریکہ ہو، چین ہو یا روس ہو، سب کی خوشامد کرنے ان کی سلامی بھرنے اور ان کو اپنا محسن تصور کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اللہ کی ذات پر اعتماد تو گویا ہماری اجتماعی ریاستی زندگی سے رخصت ہوچکا ہے۔

یہ المناک صورتحال ایسی ہے، جو دردمند افراد کو متحرک کرنے کے لئے کافی ہے۔

ہمارے حکمرانوں کا ایک ہی ادا کا حامل ہونا

اپنی پاکیزہ تہذیب سے عاری ہونے کی وجہ سے ہمارے حکمرانوں نے نظام حکومت چلانے کے لئے ایک ہی ادا سیکھ لی ہے، وہ یہ ہے کہ عالمی اداروں اور مختلف ممالک سے سودی بنیادوں پر قرضہ لیتے رہو، قرضہ کا ایک حصہ ہضم کرلو، باقی قرضہ سے ملک کا نظام چلاتے رہو۔ پھر قرضہ کی ادائیگی کے لئے بجلی اور پیٹرول وغیرہ کی قیمتیں بڑھاتے رہو۔

ہمارے حکمرانوں کا یہی وہ کردار ہے جس میں وہ بہت آگے ہیں، ریاستی نظام کو خود کفالتی بنیادوں پر چلانا، وزیروں، مشیروں اور افسروں کی سادہ گاڑیوں اور سادہ مکانوں کا انتظام کرنا، افرادِ قوم کی معاشی حالت کی بنیاد پر اپنے معیار زندگی کو سادہ سے سادہ رکھنے کے لئے کوشاں ہونا، یہ چیزیں ایسی ہیں، جن سے ہمارے حکمران آشنا ہی نہیں۔ حالانکہ یورپ کے حکمرانوں، وزیروں مشیروں اور افسروں کا نظام اسی سادہ اصول پر مبنی ہے۔ ہمارے حکمران وافسران یورپی تہذیب کو اپنانے اور یورپ کے گن گانے کے باوجود ان سے یہ بہتر اصول اور حکمرانی کا یہ طرز اخذ کرنے کے لئے تیار نہیں، اس سلسلہ میں ان کے لئے آئیڈیل وہ مغل بادشاہ اور شہزادے ہیں، جو قومی دولت کو ذاتی خزانہ سمجھکر، اسے عیاشیوں میں اڑاتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے وہ خود بھی اور قوم کو بھی انگریز کی غلامی سے دوچار کرنے کا موجب ثابت

ہوئے۔

مادیت پرست معاشرے کی المناک تصویر

پاکیزہ تہذیبی بنیادوں پر تعمیر شخصیت کے بغیر فرد وافراد پر نفسیانیت، اغراض پرستی، خونی رشتوں تک کو موت وحیات کی کشمکش کے وقت تنہا چھوڑنے، عیش پرستی اور لذت کے علاوہ پاکیزہ انسانی واخلاقی قدروں سے بے نیازی اور حیوانیت کا منظر غالب رہتا ہے، مغرب کی معاشرتی اور خاندانی زندگی اس کا زندہ نمونہ ہے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، یہ واقعہ ہمدرد صحت کراچی کے اکتوبر ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

یہ تفصیلی واقعہ دینے سے پہلے یہ انتباہ دینا ضروری ہے کہ اگر ہمارے یہاں بھی مادیت، نفسیانیت اور اغراض پرستی کی طوفانی لہریں اسی طرح چلتی رہیں تو اس سلسلہ میں ہمارا معاشرہ بھی تیزی سے انسانی اور خونی تعلقات کے حوالے سے اسی طرح کی بے حسی، بے رحمی، شقاوت قلبی اور سنگ دلی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے، بلکہ ایک حد تک ہوچکا ہے۔

اب مضمون ملاحظہ ہو، واقعہ نگار عمران سجاد صاحب ہیں:

میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

''مغرب میں مشترکہ خاندانی نظام پاش پاش ہو چکا ہے۔ یہاں رہنے والوں کا سب سے بڑا مسئلہ تنہائی اور لاتعلقی ہے۔ چند برس قبل امریکا کے ایک اسپتال میں ۲۵ سالہ لڑکی کے دماغ کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کے بعد لڑکی ڈاکٹروں کی اجازت سے اپنے اسٹینڈ کے سہارے اسپتال کے باغ میں تھوڑی دیر کے لیے چہل قدمی کرنے چلی جاتی تھی۔

اُس لڑکی کے والد پاکستانی اور والدہ امریکی تھیں۔ اُس کے والد پوری طرح مغربی ماحول میں ڈھل چکے تھے۔ وہ مغربی زندگی سے بہت متاثر تھے، اسی لیے

انہوں نے ایک امریکی عورت سے شادی کی تھی۔

ایک دن جب لڑکی باغ میں چہل قدمی کررہی تھی تو اُس کی ملاقات ایک پاکستانی خاتون سے ہوئی۔ وہ خاتون اسپتال میں داخل اپنے کسی قریبی عزیز کی عیادت کی غرض سے آئی تھیں۔ جب انہوں نے انتہائی محبت وشفقت سے لڑکی سے باتیں کرنی شروع کیں اور اُس کے حالات معلوم کیے تو وہ لڑکی رو پڑی۔ خاتون نے لڑکی کو سہارا دے کر ایک بینچ پر بٹھایا۔ اُس کا اسٹینڈ ایک طرف رکھا۔ لڑکی بُری طرح رو رہی تھی۔ خاتون نے بڑی محبت سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا: ''کیا میں آپ کی کچھ مدد کرسکتی ہوں؟'' وہ تڑپ کر بولی: ''کیا آپ کچھ دیر میرے کمرے میں میرے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرسکتی ہیں؟ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں، یہ آپ کا مجھ پر احسانِ عظیم ہوگا۔''

وہ خاتون لڑکی کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلی گئیں۔ لڑکی اُن کے محبت بھرے اندازِ گفتگو سے بہت متاثر تھی۔ کمرے میں لڑکی اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ خاتون بستر کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ لڑکی نے جلدی سے تکیے کے نیچے سے ایک البم نکالا اور بڑے پُرجوش انداز میں بولی: ''میں آپ کو اپنے خاندان کے لوگوں کی تصویریں دکھاتی ہوں۔'' اُس نے البم کھولا اور ایک تصویر پر اُنگلی رکھی اور کہا: ''یہ میرے والد ہیں۔'' پھر ایک دوسری تصویر پر اُنگلی رکھی اور کہا: ''یہ میری والدہ ہیں۔'' ایک تیسری تصویر پر اُنگلی رکھ کر کہا: ''یہ میرے بہن بھائی ہیں۔'' وہ ایک ایک تصویر پر اُنگلی رکھتی اور کہتی جاتی: ''یہ میری خالہ ہیں۔ یہ میرے خالو ہیں۔ یہ میرے ماموں ہیں۔ یہ میرے خالہ زاد بہن بھائی ہیں۔ یہ میرے تایا ہیں۔'' پھر البم کی آخری تصویر پر اُنگلی رکھ کر کہا: ''یہ میرا منگیتر ہے، مگر یہ اسپتال اور بیماریوں سے بہت ڈرتا ہے۔'' خاتون نے لڑکی سے پوچھا: ''کیا یہ سب لوگ کہیں بہت دُور رہتے ہیں؟'' لڑکی دوبارہ رونے لگی۔ خاتون نے اندازہ لگایا کہ اس لڑکی کا خاندان کہیں بہت دُور رہتا

ہے، اسی لیے اُن سب کو یاد کرکے یہ رو رہی ہے۔ خاتون نے پھر دریافت کیا: ''یہ سب لوگ کسی دوسرے شہر میں رہتے ہیں؟'' لڑکی نے روتے ہوئے جواب دیا: ''سب لوگ اسی شہر میں رہتے ہیں۔ مجھے اسپتال میں چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر پلٹ کر پوچھنے تک نہیں آئے۔ مجھے اسپتال میں رہتے ہوئے پورا ایک مہینا ہوگیا ہے، لیکن کوئی مجھے دیکھنے تک نہیں آیا۔ میرے ٹیلی فون کا جواب تک نہیں دیتے۔ سب مصروف ہیں۔ کسی کے پاس تھوڑا سا وقت بھی نہیں ہے۔'' لڑکی شدید افسردہ، مایوس اور بے چین و بے قرار تھی۔ وہ زندگی سے مایوس دکھائی دیتی تھی اور اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔

خاتون کئی دن تک اسپتال جاتی رہیں۔ ہر مرتبہ انہوں نے دیکھا کہ لڑکی کی بیماری بڑھتی جارہی ہے۔ ڈاکٹر اُس کے بارے میں بہت فکرمند تھے۔ پھر چند دنوں تک خاتون اسپتال نہ جاسکیں۔ چند دن بعد جب وہ اسپتال گئیں تو اُس لڑکی کو دیکھنے اُس کے کمرے میں بھی گئیں۔ کمرا خالی پڑا تھا۔ خاتون مسکرانے لگیں، وہ سمجھ گئیں کہ لڑکی کے گھر والے بالآخر اُس کو گھر لے ہی گئے۔ یہ سوچ کر خاتون نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا: ''یااللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے میری دعائیں سُن لیں اور انہیں قبول بھی کرلیا۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ خاتون اپنے عزیز سے مل چکی تھی۔ وہ صحتیاب ہو چکے تھے اور کل شام اسپتال سے گھر جانے والے تھے۔

خاتون خوشی خوشی گھر جانے کے لیے اسپتال کی سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ سامنے سے ایک نرس آرہی تھی۔ اس نرس کو وہ کئی بار لڑکی کے کمرے میں دیکھ چکی تھیں۔ نہ جانے خاتون کے دل میں کیا خیال آیا کہ عالمِ سرخوشی میں انہوں نے نرس کو روک کر کہا: ''سسٹر! سُنا تم نے! کمرہ نمبر ایک میں جو خوب صورت سی لڑکی تھی، اُسے اُس کے گھر والے آخر لے ہی گئے، اس کے گھر جانے کی وجہ سے میں

آج بے حد خوش ہوں۔'' نرس نے کہا: ''خاتون! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اس لڑکی کا تو تین دن قبل انتقال ہو چکا ہے۔ اُس کے گھر کا کوئی فرد اسپتال تک نہیں آیا۔ اُس کے مردہ جسم کی تجہیز و تکفین کے لئے ایک خیراتی ادارہ لے گیا، جو ملک بھر میں لاوارث لوگوں کی تدفین کا انتظام کرتا ہے۔ خاتون یہ سُن کر بُری طرح رونے لگیں:

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اُداسی وہ فضائے گریاں ساماں ہائے ہائے
وہ تیرے ہونٹوں پہ کچھ کہنے کی حسرت وائے شوق
وہ میری آنکھوں میں کچھ سُننے کا ارماں ہائے ہائے

اس دور کی غیر معمولی حساسیت کی بیماری

اور اس کے ازالہ کے لئے فکرمندی کی ضرورت

اس دور کی ایک بڑی بیماری غیر معمولی حساسیت کی بیماری ہے، مزاج کے خلاف بات ہوجائے، اپنے مسلک کے خلاف دوسروں سے عمل واقع ہو، اپنے ذہنی سانچہ سے عدم مطابقت رکھنے والے فرد سے واسطہ ہو، معاملات اور مسائل میں تھوڑا سا بھی اختلاف پیدا ہو تو مزاج کی غیر معمولی حساسیت کارفرما ہونے لگتی ہے، جس سے یا تو افراد سے تعلقات منقطع ہوجاتے ہیں یا دوری پیدا ہوجاتی ہے۔

افرادِ معاشرہ کی اس حساسیت نے ملت کی وحدت کو ہی نہیں، گھروں، خاندانوں اور دوستوں میں بھی تفریق پیدا کردی ہے اور دلوں میں ایک دوسرے سے رنجیدگی کو بھر دیا ہے، یہ حساسیت دراصل اپنی نفسیاتی برتری کے احساس میں مبتلا ہونے، بلکہ نفسیاتی برتری میں جیتے رہنے ہی کا شاخسانہ ہے۔

افراد کا افراد سے ٹکراؤ، گروہوں کا گروہوں سے ٹکراؤ، اہل علم اور اہل دانش کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ، یہ سب اسی نفسیاتی سانچہ کا نتیجہ ہے۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ انسان دراصل نام ہے، احساس کا، احساس اگر پاکیزہ ہوجائے تو فرد کی زندگی پاکیزگی کا نمونہ بن جاتی ہے اور اس سے پاکیزہ احساسات جنم لیتے ہیں، لیکن اگر احساس خراب ہو اور سراسر منفی ہوجائے اور شخصیت کی تشکیل میں منفی احساس کا غلبہ ہوجائے تو ساری شخصیت اور اس کی ساری زندگی تلخیوں سے بھر جاتی ہے اور دوسروں کے بارے میں منفی رویے سے عبارت ہوجاتی ہے۔

جب معاشرہ میں ذاتی احساس برتری کے نتیجہ میں حساسیت کی بیماری غالب ہوجائے تو وہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ، انتشار وخلفشار اور اس کے عملی مظاہر سے بچ جائے، محال ہے۔

اپنی نفسیاتی برتری کے احساسات میں جیتے رہنے کی بیماری معمولی بیماری نہیں، اس کے اثرات افراد، خاندانوں اور خود معاشرہ کو بھگتنے پڑتے ہیں، اس لئے اس بیماری سے بچاؤ کی تدابیر کا ہونا ضروری ہے۔

انسان جب اجتماعیت کی پیداوار ہے اور اجتماعیت کے بغیر اس کی زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں تو اسے افرادِ معاشرہ کے ساتھ سلیقۂ محبت اور رواداری کے ساتھ چلنے اور ساتھ رہنے کی استعداد حاصل ہونا چاہئے، ورنہ انسانی معاشرہ درندوں کے معاشرہ سے ہی عبارت ہوجائے گا۔

یہ ایسا اہم مسئلہ ہے، جس کی ازحد فکر ہونا ضروری ہے کہ افرادِ معاشرہ کے احساس کی تیزی کو کس طرح اعتدال میں لایا جائے اور ان کی نفسیات میں کس طرح بہتری پیدا ہوجائے، یہ کام ایسا ہے، جو ایک حد تک تعلیم کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے، لیکن تعلیم سے زیادہ اس کا تعلق تربیت سے ہے، تربیت کے ذریعہ دلوں میں یہ بات راسخ کرنی ہے کہ انسان، انسیت سے عبارت ہے اور ایک دوسرے سے انسیت کے بغیر انسان، انسان نہیں رہتا، پھر انسان کی فطرت بھی محبت کے جذبات سے سرشار ہے، اس محبت کا مرکز اپنے حقیقی محبوب سے محبت کا محور ہے، جب محبوب حقیقی سے

محبت کے جذبات فروغ پذیر ہوتے ہیں تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر احساسات میں پاکیزگی پیدا ہوجاتی ہے اور یہ پاکیزگی افراد کو افراد سے بے غرضانہ محبت کا سلیقہ سکھانے کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس لئے پاکیزہ محبت کے جذبات کو بیدار کرنے کا تربیتی نظام مستحکم ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ درست نہیں ہوسکتا۔

تربیت کا جو پاکیزہ نظام ہمارے لئے موت وزندگی کے مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے، بدقسمتی کی بات ہے کہ ہم نے اسے اس طرح نظر انداز کیا ہے کہ گویا سب سے زیادہ غیر اہم کام ہی یہی ہے، ہمارے ہاں ظاہری تعلیم، کتابی تعلیم، فنون کی تعلیم اور سیکڑوں نوعیت کے علوم وفنوں کی تعلیم مروج ہے، لیکن انسانی فطرت میں موجود محبوب حقیقی سے محبت کے پاکیزہ جذبات کو بیدار کرکے، اسے ارتقائی مراحل تک پہنچانے کے تربیتی کام کو کوئی اہمیت حاصل نہیں، قدیم دینی درسگاہیں ہوں یا جدید تعلیمی ادارے، لگ بھگ ان سب میں اس طرح کی پاکیزہ تربیت کا کوئی نظام موجود نہیں۔

جس تربیت سے افراد کے پاکیزہ احساسات اور پاکیزہ کردار کا تعلق ہو، جس تربیت سے افرادِ معاشرہ میں محبت ورواداری، صبر وتحمل کا سلیقہ پیدا ہوتا ہو، اس تربیت کو اہمیت نہ دینا، سب سے بڑی زیادتی ہے، اس کی سزا یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ میں بے رحمی، مزاج کے اختلاف کی وجہ سے قطع تعلق، اختلاف مسلک کی وجہ سے ایک دوسرے سے نفرت کے جذبات موجود ہیں۔

موجودہ دور میں اپنے اس پاکیزہ تربیتی نظام کی بحالی کی اہمیت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہے۔کیا دینی ومذہبی قیادت اور درسگاہوں کے ذمہ دار صاحبان ہماری اس صدا کو اہمیت دے کر اس پر غور وفکر فرمائیں گے؟

خود احتسابی سے محرومی کے نتیجہ میں جنم لینے والے امراض

خود احتسابی سے محرومی کے نتیجہ میں ایک بڑا مرض جو جنم لیتا ہے، وہ غصہ اور

اشتعال کا مرض ہے اور یہ ایسا مرض ہے، جس سے افرادِ معاشرہ کے دل ایک دوسرے سے ٹوٹ جاتے ہیں، دشمنی وافتراق پیدا ہوجاتا ہے، اور امت تفریق وانتشار کا شکار ہوجاتی ہے۔

غصہ کا حق پانچ افراد کو حاصل ہے، باپ کو بیٹے پر، میاں کو بیوی پر، استاد کو شاگرد پر، شیخ کو اپنے مرید پر، مالک کو ملازم پر، اس کے علاوہ جو بھی غصہ واشتعال کا مظاہرہ کرے گا، اس سے ایسا شر پیدا ہوگا، جس سے بچاؤ کی صورتوں کا پیدا ہونا دشوار ہے۔

امت میں ہم گروہ بندی اور انتشار وافتراق کا جو منظر دیکھ رہے ہیں، اس کا بنیادی سبب غصہ واشتعال کی نفسیات ہے، یہ نفسیات ایسی ہے کہ فرد اپنے ساتھ اختلاف کرنے والوں کو مارنے مرنے پر تیار ہوجاتا ہے۔

خود احتسابی کے ذریعہ اپنے اندر میں ڈوب کر اپنا جائزہ لینے کی ضرورت اس لئے بھی ہے، تاکہ فرد، اپنی شخصیت کے ذریعہ معاشرہ کو خلفشار سے بچا سکے، اور وہ دوسروں کے دل میں ٹوٹ پھوٹ پیدا کرنے سے بچ سکے، دعوتی کام کا استحقاق بھی انہی افراد کو حاصل ہے، جو ایک حد تک نفس کی ان طوفانی لہروں سے آشنا ہوچکے ہوں اور جنہیں اپنی نفسی خرابیوں کا پوری طرح ادراک حاصل ہو۔

ہر نفس کی کہانی

ہر نفس کی کہانی (سوائے خوش نصیب افراد کے) یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ یکسو نہیں ہوتا اور نہیں ہونا چاہتا، اس لئے کہ اس کے لئے خواہشات کی قربانی دینا پڑتی ہے، مادی راحت کے سامان سے دستبرداری اختیار کرنا پڑتی ہے اور نفس کو مجاہدوں کی بھٹی سے گزارنا پڑتا ہے، یہ ایسی چیزیں ہیں، جس کے لئے نفس تیار نہیں، ان چیزوں کے بغیر نہ تو اللہ سے یکسوئی کی فضا پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی تہذیب نفس اور سلیقۂ انسانیت حاصل ہوتی ہے۔

نفس کی یہ حالت کیوں ہے؟ اس لئے کہ نفس کی ساخت میں دنیا پر ٹوٹ پڑنے کے جذبات موجود ہیں، جب خارجی ماحول خالص مادہ پرستی پر مبنی ہو تو اس سے نفس کی خواہشات کے زور وطاقت میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے۔

نفس امارہ کے زور کو توڑ کر، اسے مہذب بنانے میں انسانی شخصیت میں بعض ایسی طاقتور جوہری چیزیں رکھی گئی ہیں کہ اگر حوصلہ وہمت سے کام لیکر، ان جوہری چیزوں کو ابھارا جائے اور انہیں طاقتور بنانے کی کاوش کی جائے تو نفس امارہ کی حالت میں تبدیلی آسکتی ہے اور یہ نفس لوامہ سے مطمئنہ کے مراحل میں داخل ہوسکتا ہے۔

یہ طاقتور جوہری اجزاء دل وروح اور فطرت سلیمہ کے اجزاء ہیں، ان کی مدد سے فرد کے نفس کے حالات میں غیر معمولی تغیر برپا ہوسکتا ہے، لیکن انسان کی یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ عام طور پر دل وروح کی مدد سے نفس امارہ سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اس کی جو سزا فرد کو ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنی سب سے محسن ہستی جو اس کی خالق ہستی ہے، اس سے وفاداری کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اس طرح وہ اپنے حقیقی معبود سے بغاوت اختیار کرتا ہے اور نفس اور مادیت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے، چونکہ نفس اور مادیت کے معبود، کمالات وخصوصیت اور حسن کی صفات کی بجائے شر محض ہیں، اس لئے نفس اور مادیت کی پرستش کی وجہ سے فرد وافراد فساد سے دوچار ہوجاتے ہیں، اس طرح پورا معاشرہ فساد سے عبارت ہوتا ہے، یہ سمجھنا بڑی حماقت ہے کہ انسان اپنے حقیقی محسن ہستی جو اس کی معبود بھی ہے، اسے چھوڑ کر نفس اور مادیت کے معبودوں کی پرستش کی وجہ سے سکون کی زندگی گذار سکتا ہے، ایسا ہونا ممکن نہیں، باطل معبودوں میں وہ استعداد ہی موجود نہیں ہے کہ وہ فرد وافراد کو ذہنی، نفسیاتی، وجدانی اور روحانی طور پر سکون کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ ور کرسکیں، جعلی معبودوں کی پرستش کا لازمی نتیجہ ذہنی وقلبی

سکون کی بربادی، خوداعتمادی سے محرومی اور بے پناہ مصائب ومسائل کا شکار ہونا ہے، اس لئے ہر وہ فرد، جو اپنے محبوب حقیقی سے یکسو نہیں ہوتا اور اس کی عبادت وذکر وفکر کی راہ سے فرار اختیار کرتا ہے، اس کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے، اس کی روح بے چین رہتی ہے، اس کا دل ہزارہا خواشات کا مجموعہ بن جاتا ہے، یہ تو معمولی سزا ہے، جو محبوب حقیقی سے یکساں نہ ہونے کی صورت میں اس دنیا میں ملتی ہے، آخرت کی دنیا میں باطل معبودوں کی پرستش کی جو سزا ملے گی، وہ ناقابل برداشت ہوگی، اے غافل انسان، تجھے مہلتِ عمر حاصل ہے، خواب غفلت سے بیدار ہوکر سنبھلنے کی کوشش کر اور باطل معبودوں کی پرستش چھوڑ کر، حقیقی معبود کے سامنے سجدہ ریز ہو اور اس کی سچی وحقیقی عبادت کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہو، تجھے دنیا وآخرت کی جملہ سعادتوں سے بہرہ ور کیا جائے گا۔

باہر کے حالات کا، اندر کے احساسات کا نتیجہ ہونا

تعمیر سیرت کے حوالے سے ایک اہم نکتہ جسے سمجھنے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ دوسرے افراد کے بارے میں ہمارے دلوں میں جو تلخیاں موجود ہوتی ہیں، یا دوسروں میں جو خرابیاں ہمیں بڑی شدت سے نظر آتی ہیں، جس کی وجہ سے ہمارا دل تشویش اور ناراضگی سے بھرا رہتا ہے، وہ دراصل ہمارے اپنے اندر کے حالات کی عکاس ہوتی ہیں، ہمارا دل چونکہ عام طور پر ذکر کے نور سے خالی ہوتا ہے، اس میں غلط احساسات طاقتور صورت میں موجود ہوتے ہیں، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ہمارے دل میں سیاہی بھری ہوتی ہے، اس لئے اس سیاہی کے ساتھ جب ہم دوسروں کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں سیاہ نظر آتے ہیں اور ہمیں حسد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس طرح افراد کے بارے میں ہمارے منفی احساسات ہمیں ذہنی دباؤ اور منفی احساسات کی شدت سے بھر دیتے ہیں اور ہم دوسروں سے خوف وخطر، نفرت، حقارت اور ان کی ناکردہ برائیوں کے احساسات میں مبتلا ہوجاتے ہیں، یہ ایسی

صورتحال ہے، جو ہماری زندگی کو زہرناک بنادیتی ہے۔

بزرگوں نے کہا ہے کہ جب اندر ٹھیک ہوجاتا ہے تو باہر بھی خیریت ہی خیریت نظر آنے لگتی ہے اور دوسروں سے حسن ظن پیدا ہونے لگتا ہے، جب اندر ٹھیک نہیں ہوتا تو باہر ہمیں ہر طرف تشویشناک حالات ہی نظر آنے لگتے ہیں، یہ تشویش دراصل ہمارے اندر کی تشویش، اضطراب اور پریشانی ہی کا نتیجہ ہوتی ہے، منفی احساسات کے حامل فرد کو دوسروں میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آنے لگتی ہیں۔

اس کا علاج یہی ہے کہ منفی احساسات کو پالنے کی روش ترک کردی جائے، ہر معاملہ کے صحتمند پہلو کو دیکھتے رہنے کی عادت ڈالی جائے اور اپنے مقابلہ میں دوسروں کو اچھا سمجھنا شروع کردیا جائے۔

زندگی کو خوشگوار بنانے کا یہ سب سے بہتر گُر ہے، لیکن باطن کو بہتر اور پاکیزہ بنانے کے لئے اللہ کے ذکر کا سہارا لئے بغیر چارہ کار ہی نہیں ہے، اس لئے کہ باطن کی سیاہی اور تاریک ومنفی احساسات کو پاکیزہ احساسات میں بدلنے کی قوت اللہ کے ذکر میں ہی ہے، اللہ کا ذکر جوں جوں بڑھتا جائے گا، اسی حساب سے فرد کے پاکیزہ احساسات میں اضافہ ہوتا جائے گا اور باہر کی دنیا اسے خوفناک نظر آنے کی بجائے وہ بہتر نظر آئے گی، اور وہ حسد، کینہ، بغض اور نفرت جیسے احساسات سے محفوظ ہوجائے گا، البتہ دینی حمیت کی وجہ سے دجالی تہذیب کے علمبرداروں اور شر کی طاقتوں کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور مسلمانوں کی حالت زار پر وہ تکلیف واذیت محسوس کرے گا، یہ تکلیف واذیت دینی حمیت کا نتیجہ ہے، اس کا ذہنی دباؤ اور قلبی بے چینی سے تعلق نہیں، اللہ کے ذکر کی برکت سے وہ قلبی سکون اور خوداعتمادی سے بہرہ ور ہوگا۔

ہماری ریاست وسیاست کا بڑا المیہ

ہماری ریاست اور سیاست کا بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کا رشتہ مادہ پرست عالمی

سرمایہ دار سے اس طرح جڑ گیا ہے، بلکہ پیوست ہوگیا ہے کہ اس رشتہ کا منقطع ہونا محال ہوگیا ہے، جس کی وجہ سے ہماری ریاست کی بیشتر پالیسیاں عالمی سرمایہ دار کی مرضی کے مطابق تشکیل ہوتی ہیں، اس طرح ہم مادیت اور سیکولرزم کی دلدل میں بُری طرح پھنس چکے ہیں، اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ ہمارے سارے مؤثر طبقات جدید تہذیب اور سیکولرزم پر فریفتہ ہیں، یہ جدید تہذیب ان کے حیوانی اور نفسانی جذبات کی تسکین کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ملک کے حکمرانوں، اہل سیاست، اہل صنعت اور سارے مؤثر طبقات کے جدید تہذیب کے علمبرداروں اور اس کے نظام سے زبردست معاشی مفادات وابستہ ہیں، ان معاشی مفادات کی وجہ سے بھی وہ عالمی سرمایہ دار سے رشتہ منسلک کرنے پر مجبور ہیں۔

تیسرا سبب یہ ہے ان کی ذہنی وفکری وعلمی تربیت ہی جدید تہذیب سے ہمہ آہنگی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ عالمی سرمایہ دار اتنا طاقتور ہے اور اس کا رعب اور خوف ہمارے حکمرانوں پر اتنا غالب ہے کہ انہیں خطرہ درپیش ہے کہ اس کی ناراضگی کے نتیجہ میں ان کا اقتدار، ان کی مراعات، ان جمع کی ہوئی بے پناہ دولت چھن جائے گی، اس لئے کہ جب اقتدار کے ظاہری اور خفیہ سارے طبقات عالمی سرمایہ دار کے اسیر ہوں تو اس کے لئے ایسا کرنا مشکل نہیں۔

عالمی سرمایہ دار چاہتا ہے کہ ملت اسلامیہ میں اس کی مادر پدر تہذیب کا غلبہ ہو، ملت اس کی مقروض ہو، ان کے یہاں موجود زیر زمین سارے قدرتی ذرائع پر ان کا قبضہ ہو اور ملت پر ان کی مسلط کی ہوئی پالیساں جاری ہوں، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو پچھلے ساٹھ ستر سال سے عالمی سرمایہ دار کی مرضی کے مطابق ہورہی ہیں۔

چنانچہ ہمارے یہاں کے مراعات یافتہ طبقات معاشی طور پر مستحکم سے مستحکم تر ہورہے ہیں، عوام کی اکثریت روٹی کی محتاج ہوتی جارہی ہے، سرمایہ داری نظام کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ سارا سرمایہ چند ہاتھوں میں سمٹ کر آتا ہے اور عوام پس کر رہ جاتے ہیں۔

عالم اسلام میں ترکی واحد ملک ہے، جو اردگان کی سربراہی میں عالمی سرمایہ دار سے آنکھوں میں آنکھیں ملانے کی جرات کر رہا ہے، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ایک تو عوام کی قوت ان کے ساتھ ہے، دوم یہ کہ اہل تصوف نے پچھلے سو سال سے ترکی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا جو کام کیا ہے، اردگان اس کی پیداوار اور اس کی نشانی ہے، اردگان، صوفیہ کا صحبت یافتہ بلکہ تربیت یافتہ ہے، اگرچہ اسے اپنی مصروفیات کی وجہ سے صوفیہ کی زیادہ صحبت کا موقع نہ مل سکا، تاہم اس کی شخصیت پر صوفیہ کی صحبت کے زبردست اثرات موجود ہیں، ترکی کے اہل تصوف بھی اردگان کو اپنا سرمایہ سمجھتے ہیں، اس سرمایہ کی حفاظت کے لئے وہ اس کی پشت پر کھڑے ہیں۔ اگرچہ ترکی کا دستور اب تک لادینیت پر مشتمل ہے، لیکن آہستہ آہستہ تبدیلی کا عمل جاری ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے، ہمارے یہاں کی سیاسی قیادت عالمی سرمایہ دار کی خوشامد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لئے کوشاں رہتی ہے، اس کی خاطر وہ غلامانِ مصطفیٰ کو پھانسی تک دینے پر آمادہ ہوتی ہے، جب اہل سیاست کی ایمانی حمیت اس حد تک گرجائے تو حالات کی خرابی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے سچ فرمایا ہے کہ دنیا کی محبت ساری برائیوں کی جڑ ہے۔

دنیا کی محبت اپنے ساتھ حبِ جاہ وحبِ مال، بزدلی، منافقت، ملی مفادات کی پامالی، ضمیر کی مردگی اور مادہ پرست تہذیب سے مرعوبیت جیسی ساری بُرائیاں ہمراہ

لاتی ہے، اللہ ہماری حالت زار پر رحم فرمائے آمین۔

دنیا کے ڈھیر جمع کرنا دراصل مٹی کے ڈھیر جمع کرنے کے مترادف ہے، نہ اسے کھا سکتے ہیں نہ استعمال کرسکتے ہیں، یہ تو محض دل بہلانے کی چیز ہے، دل بہلانے کی خاطر ملت کے مفادات کی پامالی، ملت کے کروڑہا افراد کو روٹی سے محروم کرنا اور ان کے مستقبل کو داؤ پر لگانا، یہ ذہنی وقلبی سکون سے محرومی، لوگوں کی آہیں لینا اور قبر اور آخرت کے عذاب کو خریدنے کے مترادف ہے، جو سب سے بڑی نادانی کی بات ہے، سنبھلنے کی ضرورت ہے۔

ذہین افراد کا حقائق سے ناآشنائی کا المیہ

تعمیر شخصیت کے حوالے سے ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ اکثر ذہین وباصلاحیت افراد اس معاملہ میں بہت پیچھے ہوتے ہیں، اس لئے کہ اکثر ذہین افراد کا ہدف دنیا ہوتی ہے، ان کی ساری توانائیاں دنیا کے حصول میں خرچ ہوجاتی ہیں، جو ذہین اور باصلاحیت افراد دینی ومذہبی جماعتوں سے وابستہ ہوتے ہیں، ان میں بھی اکثر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ خود رائی کی بیماری کی وجہ سے جماعتوں، تحریکوں، اداروں اور دوستوں وساتھیوں کے لئے مسائل ومشکلات پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ذہانت وصلاحیت کی وجہ سے ان میں فکرمندی اور تحرک تو موجود ہوتا ہے، لیکن دل کی صلاحیتوں کی عدم بیداری کی وجہ سے ان کا صحیح رخ متعین نہیں ہوپاتا، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دوستوں وساتھیوں کے لئے اذیت کا موجب ثابت ہوتے ہیں، اس طرح ان کا علم، ان کی دانش، ان کی صلاحیتیں اکثر خود رائی کی نذر ہوجاتی ہیں، خود رائی کی بیماری ایسی ہے، جس سے جتنے بھی مضر اثرات پیدا ہوں کم ہیں۔

اس طرح کے ذہین افراد کا بیشتر وقت تجاویز، مشوروں اور کاغذی منصوبہ بندی میں خرچ ہوتا ہے، وہ اپنے حصہ کا کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ان کے پاس

کام کا منصوبہ تو بہت ہوتا ہے، لیکن مثالیت پسندی اور ذہن کے زیادہ استعمال اور اس پر انحصار کی وجہ سے وہ عملی صلاحیتوں سے عاری ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ان کے حصہ کا کام بھی دوسرے کریں، اس طرح وہ ساتھیوں کے لئے اذیت وتکلیف کا موجب بن جاتے ہیں، ان کی زندگی بھر کی یہی روش ہوتی ہے، یہ سب نتیجہ ہوتا ہے، دل کی خفتہ صلاحیتوں کی عدم بیداری کا اور دل کے مفتی سے کام نہ لینے کا، لیکن دل کا مفتی خود رائی سے دستبرداری اور کسی اہل اللہ کا دامن تھامنے سے ہی بیدار ہوتا ہے، ورنہ خالی ذہانت فرد کے لئے انسانی نفسیات کے حقائق اور اس کی خرابیوں کے انکشاف سے عاری کرنے کا موجب بن جاتی ہے۔

اپنی ذات کی فراموشی کی قیمت پر دوسروں کی عیب جوئی کی روش

فرد اگر دوسروں کو ہدف ملامت بنانے اور ان کی کمزوریاں وکوتاہیاں تلاش کرنے کی بجائے اپنی کمزوریوں اور عیوب کو دیکھنے کے لئے خود احتسابی سے کام لینے کی عادت ڈالے تو اس پر اپنے نفس کی اتنی خرابیاں واضح ہوتی جائیں گی کہ دوسروں کے عیوب اسے اپنے عیبوں کے مقابلہ میں ہیچ نظر آئیں گے، جب وہ خوداحتسابی کے ذریعہ اپنی اصلاح کا عمل شروع کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ نفسی قوتوں کی اصلاح اور اس کی صفائی کے سلسلہ میں وہ جس قدر مجاہدوں سے کام لے رہا ہے، نفس کے اندر سے اسی قدر خواہشات وجذبات اور مادی نوعیت کی نئی نئی امنگیں سامنے آتی جارہی ہیں، اس طرح وہ نفس کے تزکیہ اس کی تہذیب واصلاح میں زندگی کا بڑا حصہ خرچ کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے، اس لئے کہ خود احتسابی اور مجاہدوں کے ذریعہ نفس کی خونخوار قوتوں سے اس کی آشنائی ہوگئی ہے، اب وہ نفس کو مہذب بنانے اور اسے نفس مطمئنہ کے مقام تک پہنچانے کے لئے ہر ممکن حد تک مجاہدوں میں مصروف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اصلاح کے حقیقی خواہشمند اور اللہ کے سچے طالب کی تہذیب نفس کے سلسلہ میں یہی روش بلکہ یہی دستورالعمل ہوتا ہے،

ایسا فرد دوسروں کے عیبوں کی تلاش اور ان کی تشہیر میں اپنا وقت صرف کرنے کا ہرگز متحمل نہیں ہوتا، اس لئے کہ اس کی نظر میں ایسا کرنے ایسے ہے، جیسے اپنے جسم پر بیٹھے ہوئے سانپ کو مارنے کی فکر کی بجائے، دوسروں کے جسم پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کو ہٹانے کے لئے فکر مند ہونا ہے۔

خوداحتسابی کے ذریعہ اپنے اندر کی وسیع تر دنیا میں ڈوبے بغیر فرد پر اپنی نفسی خرابیاں واضح نہیں ہوتی اور وہ نفس کے وسیع بت خانے سے آشنا نہیں ہوتا، اس ناآشنائی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب کے کھوجنا اور ان کی تشہیر میں اپنا وقت اور توانائیاں صرف کرنے لگتا ہے، یہ ایسا سودہ ہے، جو فرد کے لئے ہلاکت کا باعث بنتا ہے، اس لئے کہ نگاہ کی خاصیت یہ ہے کہ جب وہ دوسروں کی طرف جاتی ہے تو اپنی طرف اٹھنے نہیں پاتی، اس طرح زندگی بھر اپنی خرابیوں کا ادراک وشعور ہونے نہیں پاتا اور فرد اپنے آپ کو پاک پوتر اور دوسروں کو خرابیوں اور فتنوں کا مجسمہ سمجھنے لگتا ہے۔

اس طرح عدم خوداحتسابی کی بنا پر فرد اپنی ذات کی وجہ سے معاشرہ میں فساد برپانے کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔

معاشرہ میں جو بھی انتشار، جھگڑے اور خلفشار نظر آتا ہے، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ فرد خود احتسابی کے ذریعہ اندر میں ڈوب کر، اپنی نفسی خرابیوں اور اندر میں موجود بڑے بت کدے اور اس کی سنگین نوعیت کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

اللہ جس پر اپنا فضل خاص فرماتا ہے، اسی کو خوداحتسابی کے ذریعہ اپنی اصلاح کی راہ پر گامزن فرماتا ہے، ''**ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَن یَشَاءُ**''

قرآن میں ایک جگہ ''**فَلَا تُزَکُّوا أَنفُسَکُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَی**'' (اپنے آپ کو پاک باز نہ سمجھو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تم میں متقی کون ہے؟)

حقیقت یہ ہے کہ نفس وشیطان کا سب سے بڑا فریب یہ ہوتا ہے کہ وہ فرد

وافراد کو معرفت نفس کی راہ سے دور کر کے، دوسروں کے مشغلہ میں مصروف رکھکر اس کی راہ کھوٹی کرنا چاہتا ہے، چونکہ دوسروں کی عیب جوئی اور ان کی خرابیوں کے تذکرے میں نفس لذت محسوس کرتا ہے، اس لئے وہ اس لذت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا، البتہ اللہ کی محبت اور اس کے ذکر کی لذت سے آشنا فرد میں ہی رفتہ رفتہ یہ استعداد پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہے کہ دوسروں سے زیادہ اس پر اپنی اصلاح کی فکر غالب رہتی ہے اور وہ آخر وقت تک تہذیب نفس کے عمل میں مصروف رہتا ہے۔

حضورﷺ کی ایک دعا ہے، جس کے الفاظ ہیں: یا اللہ مجھے چشم زدن کے لئے بھی نفس کے حوالے نہ کردے، یہ دعا دراصل امت کی تربیت ہی کے لئے ہے۔

وہم کی بڑھتی ہوئی بیماری خوداعتمادی کے بحران کا نتیجہ

آج کے دور میں بالخصوص نوجوان نسل میں ایک بیماری جو پیدا ہوگئی ہے، وہ وہم کی بیماری ہے، وہم کا مطلب یہ ہے کہ ایک فرضی چیز کو حقیقت سمجھتے ہوئے اس میں گھلتے رہنا، اس وہم کو اپنی شخصیت پر طاری کرنا، اس وہم کے حوالے سے لاشعور سے نکلنے والے احساسات کا شدید سے شدید تر ہونا، اس وہم کی وجہ سے نیند کا بُری طرح متاثر ہونا، خیالات اور وسوسوں کے طوفان کا برپا ہونا، اس وہم میں بعض اوقات فرد کو نظر آتا ہے کہ فلاں عزیز اور دوست میرے خلاف سازشیں کررہے ہیں، مجھے ہر طرح کا نقصان پہنچانے کے لئے کوشاں ہیں، میری خوشی وترقی سے وہ حسد وجلن میں مبتلا ہوگئے ہیں یا آنے والے حالات سے بہت زیادہ خوف زدہ ہونا کہ کہیں میرا کاروبار تباہ نہ ہوجائے، میری ملازمت ختم نہ ہوجائے، میرے بیوی بچے مجھ سے چھوٹ نہ جائیں۔ اس طرح میں تنہا ہوجاؤں اور فاقوں کا شکار ہوجاؤں، اس طرح کے بہت سارے وہم ہیں، جو فرد وافراد کو گھیر لیتے ہیں، جس سے فرد ذہنی دباؤ کا شکار ہوجاتا ہے۔

وہم کی یہ بیماری دراصل خود اعتمادی کے بحران کا نتیجہ ہے۔ خوداعتمادی کا یہ بحران خالص روحانی نوعیت کا بحران ہے۔ روح کو جب انوار ذکر کی مطلوبہ خوراک ملنا شروع ہوگی تو روح کو تشفی حاصل ہوگی اور شخصیت، خوداعتمادی کے بحران سے بلند ہوجائے گی۔ وہم کی بیماری اور اس کے ازالہ کے موضوع پر ہم نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے، جو ہماری کتاب ''جدید انسان کا داخلی بحران'' میں شامل ہے۔ اسے دیکھ لیا جائے۔

اہل عقل کی اہل تصوف کے خلاف محاذ آرائی

موجودہ دور ایسا آگیا ہے کہ تزکیہ کی بات، محبت ومعرفت کی بات، باطن کی اصلاح کی بات، نفس کی ہولناک قوتوں سے معرکہ آرائی کی بات کو سمجھنے کے لئے ذہن آمادہ نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ فرد، ذہن کا اسیر بن کر رہ گیا ہے، جو بات عقل کی سمجھ میں نہ آئے، اس کے انکار کی روش غالب ہے، ہر پھر عقلیت پسندوں کی یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ تصوف واہل تصوف کی اسلام میں کوئی گنجائش موجود نہیں۔ نیز اہل تصوف نے ایک نیا اسلام ایجاد کیا ہے، جس میں کشف، کرامات، تصرف اور دوسری دنیا کے مشاہدات کی چیزوں کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سارے اکابر بزرگان دین کا اس پر اجماع ہے کہ کشف والقا اور دوسری دنیا کے مشاہدات، صاحب مجاہدہ بزرگ کا انفرادی فعل ہے، یہ مشاہدات صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ یہ چیزیں نہ تو تصوف کے بنیادی اہداف وبنیادی اصولوں میں شامل ہیں، اور نہ ہی تصوف وبزرگی میں کمال کے لئے یہ چیزیں لوازمات میں شامل ہیں۔ تصوف میں بنیادی چیز اخلاص، للھیت، اخلاق وکردار کی بلندی، شریعت پر عمل پیرا ہونے کی استعداد اور حمیت دین اور ہر سنت پر عمل پیرا ہونے کا شوق فقر وزہد اور اہل دنیا سے استغنا اصل یہ چیزیں ہیں۔ جن میں بزرگان دین اور اہل تصوف دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

چونکہ عقل کے صاحبان کی باطنی حسین اور باطنی بصیرت کام کرنے سے قاصر ہوتی ہے، اس لئے وہ اپنی ذہانت کی بنیاد پر اہل تصوف کی ان چیزوں کو بنیاد بنا کر ان کی تحقیر وتکذیب وتردید میں اپنی ساری ذہنی وعلمی صلاحیتیں صرف کرتے رہے ہیں،اس وقت تصوف دشمنی کے اس قافلہ کے علمی قائد ہمارے دوست جاوید احمد غامدی صاحب ہیں۔ وہ اپنی لچھیدار گفتگو کی وجہ سے ہزارہا سے زیادہ نوجوان نسل کو اہل اللہ سے دور کرکے، ان کے تزکیہ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

آج کا دور میڈیا کا دور ہے، ہر بات کو عقلی طور پر پیش کرنے کا دور ہے، اگرچہ اہل تصوف کے پاس بھی اپنے موقف کی صحت کے لئے علمی وعقلی دلائل موجود ہیں، لیکن اس دور میں چونکہ روحانیت اور روحانی ارتقاء کی بات کو سننے وسمجھنے کے لئے عام طور پر ذہن آمادہ نہیں ہیں، اس لئے کہ مادہ پرستی کی ہمہ گیر فضا نے لوگوں کو رسمی اسلام پر اکتفا کرنے اور ایمان اور اللہ کی محبت کی گہرائیوں میں جانے کے سلسلہ میں سخت رکاوٹیں ڈال دی ہیں۔

ان حالات میں حقیقی اہل تصوف مخالفت وحمایت سے بے نیاز ہوکر، اپنی اصلاح اور اپنے ساتھیوں کی اصلاح کے کام ہی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اہل تصوف، اہل عقل کی طرف سے پیش کردہ جوابات دینے کے روادار نہیں ہیں۔ ان کا یہ موقف ایک اعتبار سے بجا ہے، اس لئے کہ جب اہل علم واہل عقل، عقلیت سے بلند ہوکر باطنی حسوں اور باطنی معرفت کے فہم کے لئے آمادہ ہی نہ ہوں تو ان پر ہر صورت میں انہیں قائل کرنے کی ذمہ داری تو عائد نہیں ہوتی۔

ذہانت کے استعمال میں عدم احتیاط سے پیدا ہونے والی خطرناکیاں

ذہانت اللہ کا انعام بھی ہے تو آزمائش بھی۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ ذہانت ان کے لئے انعام سے زیادہ آزمائش ثابت ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ اول حکیم نور الدین کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

حکیم نور الدین صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمتہ اللہ کے

شاگرد کے شاگرد تھے، استاد نے دوسرے طلبہ کے ساتھ جب اسے علم کی دستار پہنائی یا سند دی تو اسے تاکید کی کہ انہوں نے ظاہری علم میں بڑی محنت کی ہے، اب وہ باطنی اصلاح کے لئے کسی اہل اللہ سے رجوع ہوکر، مجاہدوں سے کام لیں۔ حکیم نور الدین نے استاد سے کہا کہ مجھے تو اب سب کچھ حاصل ہوگیا ہے، کسی سے باطنی علم حاصل کرنے کی میں کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا، استاد نے کہا، نورالدین، مجھے تمہاری ذہانت سے امت کو سخت نقصان پہنچانے کا خطرہ نظر آتا ہے، اس لئے میں تمہیں اس کی تاکید کرتا ہوں۔

خیر چند سال کے بعد جب مرزا غلام احمد قادیانی نے عیسائیوں سے مناظرے کئے، اور ان کی تقاریر کی شہرت ہونے لگی تو حکیم نورالدین ان کی ذہانت سے غیرمعمولی طور پر متاثر ہوئے اور ان سے دوستانہ تعلقات استوار کر لئے۔ مرزا صاحب دعوؤں پر دعوے کرتے رہے، حکیم نور الدین ان کی حمایت کرتے رہے، اس طرح وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پہلے خلیفہ بننے کے حقدار ہوئے۔

غیرمعمولی ذہانت سے چونکہ دعویٰ اور بڑے پن کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس لئے یہ ذہانت فرد کے لئے باعث خطرہ بن جاتی ہے۔ اگر حکیم نور الدین اپنے استاد کی بات مان لیتے، کسی اہل اللہ کی صحبت اور ذکر وفکر کے مجاہدوں سے تزکیہ کی راہ پر گامزن ہوتے تو ان کا یہ حشر نہ ہوتا کہ ایمان ہی غارت ہوگیا۔

ہمارے اس دور کے ایک مجتہد مطلق شخصیت کا کہنا ہے کہ امت میں سب سے زیادہ فساد اہل تصوف نے پیدا کیا ہے۔ اہل تصوف، مرزا غلام احمد قادیانی سے بھی زیادہ صحیح اسلام کے لئے خطرناک ثابت ہوئے ہیں۔

چونکہ یہ مجتہد شخصیت خود غیرمعمولی ذہانت کی حامل ہے، اس لئے یہ ذہانت اسے سبیل المومنین کی مخالفت کی راہ پر گامزن کرنے پر اکسارہی ہے۔ **وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ .** (اور جس نے ہدایت کے واضح ہوجانے (یعنی قرآن کے نزول کے بعد) رسول کی مخالفت کی اور مومنوں کے علاوہ دوسری راہ اختیار کی، ہم اسے ایسا کرنے دیں گے لیکن بعد میں ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے)۔

مومنوں کے نمائندے صحابہ کرام، سلف صالحین اور بزرگان دین ہیں۔ خالی ذہن نئی نسل کو بزرگان دین کے خلاف کھڑا کرنا اور ان کی ذہن سازی کرنا خطرناک کھیل ہے، جو ذہانت کی بنیاد پر یہ مجتہد مطلق شخصیت کر رہی ہے۔

المیہ کی بات یہ ہے کہ ان مجتہد مطلق شخصیت کی لچھیدار گفتگو اور تحریروں سے نوعمر علماء بھی متاثر ہورہے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ ایک تو نوعمر علماء، باطنی بصیرت سے محروم ہیں جو اہل اللہ کی صحبت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ وہ دور جدید کے علم کلام اور جدید فکری اسلوب سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اس سے مرعوب ہیں۔

جاوید احمد غامدی صاحب اور عمار یاسر صاحب سے

دوستانہ ماحول میں کچھ باتیں

جاوید احمد غامدی صاحب کی فکر کے

حوالے سے کچھ اہم مباحث

جاوید احمد غامد صاحب کی کوشش یہ ہے کہ سلف وخلف کی قرآن وسنت کی فکر سے ہٹ کر، معاشرے میں ایسی اسلامی فکر کو متعارف کرایا جائے، جو خود ساختہ اسلامی فکر ہو اور جس میں اسلام کے حوالے سے افراد کی خواہشاتِ نفس کی تسکین کا پورا انتظام موجود ہو، نوجوان نسل جس کی ساری تربیت مادہ پرستی کے ماحول میں ہوئی ہے، غامدی صاحب کی یہ فکر ان کے لئے اس لئے قابل قبول ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کے حوالے سے ان کے جذبات واحساسات کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہے۔ یعنی مادی تہذیب سے بھی پوری طرح متمتع ہوا جائے تو ساتھ ساتھ ان کی اسلامیت کو بھی کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

جب اجتہاد کے نام پر دینی وفقہی مسائل کی ازسرنو تدوین وترتیب کا کام ہوگا اور اسلام کی نئی تشریح کے کام کو اپنا فرض منصبی سمجھا جائے گا اور یہ کام سلف وخلف کی تشریح اسلام اور اجتہادی کاوشوں سے بغاوت کی روش پر ہوگا تو اس کے نتیجہ میں یعنی اس اجتہاد کے نام پر جتنے بھی فتنے پیدا ہوں، وہ کم ہیں۔ بالخصوص جب یہ کام ائمہ سلف کی تحقیر اور اپنی علمی برتری کے زعم پر ہو تو اس سے ایسا ماڈرن اسلام وجود میں آئے گا، جس میں

عورت ومرد کی آزادی ومساوات پر زور ہوگا، اسلام، اللہ اور بندے کے درمیاں محض ذاتی تعلق کے مسئلہ کی حیثیت سے سامنے آئے گا، ریاستی نظام، سیاسی نظام اور تعلیمی نظام کی تشکیل میں عقلیت وسیکولرزم کو بنیاد قرار دیا جائے گا، جہاد وقتال کی اہمیت ختم ہوگی یا برائے نام رہ جائے گی، لڑکی ولڑکے کے نکاح کے لئے والدین کی سرپرستی اور گواہوں کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ مخلوط تعلیمی اداروں میں لڑکے اور لڑکیاں جب چاہیں، والدین اور گواہوں کے بغیر نکاح کرکے، جنسی تعلقات قائم کرسکیں گے۔

لڑکیاں آزادانہ طور پر مغرب کا سفر کرسکیں گی اور وہاں کے تعلیمی اداروں میں پڑھ سکیں گی، اس سلسلہ میں اسلام کی طرف سے کوئی قدغن نہیں ہوگی۔

جنت کی نعمتیں استعارہ کی حیثیت کی حامل ہیں، ان کا حقیقت سے تعلق نہیں۔

مغرب کا سیکولرزم اور ماڈرن ازم قابل قبول ہوگا، ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے فرد مکمل آزاد ہوگا، اس سلسلہ میں اس پر اسلام کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں ہوگی۔

غرض کہ تحقیق کے نام پر اس طرح کے اجتہادات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگا۔ مادیت کی عمومی فضا اور جدید سیکولر تعلیمی نظام سے فارغ ہونے والے لاکھوں اسکالر اس طرح کے ماڈرن اسلام کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔

مغربی تہذیب کے علمبردار اور عالمی سرمایہ دار اسی طرح کے اسلام کو مسلم معاشروں میں فروغ پذیر ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں، اس لئے کہ اس طرح کے ماڈرن اسلام کے میلانات اور فروغ پذیری کی وجہ سے اہل اسلام کو مغربی تہذیب کو اپنانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی۔

محترم جاوید احمد صاحب اپنے طبعی رجحانات کی وجہ سے اجتہاد کے نام پر تیزی سے اسی ماڈرن اسلام کی تشریح وتیاری کی راہ پر گامزن ہیں۔ اس سلسلہ میں الیکٹرانک میڈیا کی انہیں مکمل سرپرستی حاصل ہے، جب کہ اس الیکٹرانک میڈیا پر حقیقی اسلامی فاضلوں کو تفصیل سے اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت نہیں، اس لئے کہ الیکٹرانک میڈیا کو اس کے عالمی پرستوں کی طرف سے ہدایت ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ قرآن وسنت اور سلف صالحین کی اسلامی تشریح پیش کرنے والے فاضل جدیدیت سے آشنا علماء کو مواقع نہ دیئے جائیں۔ اگر مجبوری کی وجہ سے انہیں بلانے کی ضرورت درپیش ہو تو ان سے الٹے سیدھے سوالات کرکے، انہیں اصل موضوع پر نہ آنے دیا جائے، ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا اور الیکٹرانک میڈیا سے صحیح اسلام کی تصویر پیش ہونے لگے گی۔ جاوید صاحب اہل

مغرب کے منظور نظر ہیں، اہل مغرب کی طرف سے ان کی سرپرستی انہیں مبارک ہو، لیکن اذیت کی بات یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی اور بنیادی تعلیمات سے ناآشنائی کی وجہ سے ہمارے بیشتر جدید طبقات جاوید صاحب کی فکر میں موجود خرابیوں اور گمراہیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں، اس طرح وہ جاوید صاحب کے ماڈرن اسلام کے گردیدہ ہو کر، اسلام کے نام پر اہل مغرب کے طرز فکر اور طرز معاشرت کی راہ پر گامزن ہیں۔ اس المیہ پر خون کے آنسو ہی بہائے جا سکتے ہیں۔

محترم جاوید صاحب کو اس وقت تصوف میں فساد ہی فساد نظر آتا ہے، بلکہ وہ تصوف کو متوازی اسلام قرار دے رہے ہیں، حالانکہ ۱۹۸۵ء کے شروع میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی (ان سے تعلقات اس سے پہلے سے تھے ''جسارت'' میں مستقل مضامین لکھنے کی وجہ سے ملک بھر کے علمی حلقوں سے میرا غائبانہ تعارف قائم تھا۔ جسارت اس وقت ضرب اختلاف کا واحد اخبار تھا) اور میں نے انہیں بتایا کہ میرا ایک اہل اللہ سے اصلاح کا تعلق قائم ہوگیا ہے تو انہوں نے اس کی تحسین کی، اس وقت تک ان کی شخصیت پر ان کے والد جو ایک اہل اللہ کے خلافت یافتہ تھے، ان کی صحبت کے اثرات موجود تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مجھے مولانا محمد حنیف ندوی صاحب جو اس دور کے علماء میں اسلام کی فلسفیانہ تشریح کے سب سے بڑے فاضل تھے اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی زیارت وملاقات کرنی تھی، میں نے محترم جاوید صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر مجھے ان دونوں سے ملاقات کے لئے لے گئے، مولانا محمد حنیف ندوی صاحب سے انہوں نے تصوف کے موضوع پر محبانہ ماحول میں تبادلہ خیال بھی کیا، اس لئے کہ مولانا نے اہل حدیث ہونے کے باوجود اس دور میں تصوف پر بہت مؤثر اور جامع کام کیا ہے۔

جاوید صاحب کی شخصیت میں بعض بہت اچھی خوبیاں موجود ہیں، یہ خوبیاں دراصل ان کے والد صاحب کی صحبت ہی کا نتیجہ ہیں۔ ۱۹۸۵ء تک تہجد ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ اپنوں اور غیروں کو زیادہ سے زیادہ وقت دینا، ان کی اہم خوبی تھی، اپنی بات کو سلیقہ، نرمی اور غیر جذباتی انداز سے پیش کرنا، ان کی خصوصیت تھی، تہجد کے بارے میں معلوم نہیں، لیکن ان کے مزاج کی دوسری خوبیاں ان میں اب بھی موجود ہیں۔

جس والد صاحب سے ان کو یہ صفات حاصل ہوئیں، ان والد اور ان کے تصوف کے اب وہ سب سے بڑے نقاد ہیں۔

ہماری نظر میں ان کی فکری کجیوں کا اہم سبب یہی ہے کہ وہ اللہ کے دوستوں کی مخالفت میں دشمنی کی حد تک آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس طرح کی ایک حدیث قدسی بھی ہے،

جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو میرے دوست کی دشمنی اختیار کرتا ہے، میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں۔ جو شخص اللہ سے حالت جنگ میں آجائے، اس کی محرومی پر افسوس اور دکھ ہی کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

محترم جاوید صاحب کو بزرگان دین اور اہل اللہ کے بارے میں سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ وہ اپنے کشف، کرامات اور دوسری دنیا کے مشاہدات کو حرف آخر سمجھتے ہیں، وہ اس پر نازاں ہوتے ہیں، اور اسے قرآن وسنت سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سارے اکابر بزرگ اس بات پر متفق ہیں کہ کشف اور دوسری دنیا کے مشاہدات، صاحب کشف بزرگ کی ذاتی واردات ہیں۔ یہ بزرگی کا معیار بھی نہیں ہیں، بلکہ ممکن ہے جو بزرگ صاحب کشف نہ ہو، وہ صاحب کشف بزرگ سے افضل ہو۔ حضرت مجدد الف ثانی تو فرماتے ہیں کہ میں کشف کو جَو کے دانہ کے بدلہ میں بھی خریدنے کے لئے تیار نہیں ہوں، دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں کہ کشف وکرامات کی حیثیت عورت کے ماہواری کی طرح ہے، جو چھپانے کے قابل ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا نکتہ جو محترم جاوید صاحب تصوف دشمنی میں نظر انداز کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ عبادت اور ذکر وفکر کی کثرت کے ذریعہ جب نفس کی مادی قوتوں پر روحانی اور ملکوتی قوتیں غالب ہوتی ہیں تو اس کے نتیجہ میں روح کا عالم بالا میں پرواز کا عمل تو ہوتا ہی ہے۔ اگرچہ یہ ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے اور اس کی صحت کے بارے میں سو فیصد یقین بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن روح کی بلند پروازی کے نتیجہ میں دوسری دنیا کے مشاہدات بہرحال ہوتے ہیں۔

اس طرح کی ایک حدیث بھی ہے، حدیث کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ حضور ﷺ نے ایک صحابی سے دریافت کیا کہ تم نے صبح کس حالت میں کی، اس نے عرض کیا، یارسول اللہ، میں نے ایمان کی حالت میں کی، آپ نے دریافت کیا کہ اس کا ثبوت کیا ہے، صحابہ نے عرض کی، یا رسول اللہ میں دن کو روزہ رکھتا ہوں، اور رات بھر عبادت کرتا ہوں، اور مجھے گویا جنتی جنت میں دکھائی دیتے ہیں اور جہنمی جہنم میں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ایمان کی اس حالت کو نہ صرف صحیح قرار دیا، بلکہ اس کی تعریف کی۔

دوسری بھی حدیث شریف ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ جب نفلی عبادت کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا ہے تو میں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ کام کرنے لگتا ہے۔ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے۔

دراصل محترم جاوید احمد غامدی صاحب کو اہل اللہ سے بدظنی کی بنا پر ان سے پُرخاش ہوگئی ہے۔ ورنہ حقیقت میں حقیقی اہل اللہ تو انسانیت کا سرمایہ ہیں، انسانیت، سلیقہ انسانیت انہی سے سیکھتی ہے۔

جاوید صاحب کے فکر کے تین اجزاء ایسے ہیں، جو ان کے لئے، ان کے دوستوں اور ان کا پروگرام سننے والوں کے لئے ذہنی پراگندگی کا سبب ہیں۔

ایک یہ کہ اسلام کو محض اللہ اور بندے کے درمیاں ذاتی تعلق قرار دینے کی فکر، جس کے نتیجہ میں اسلام کے پورے اجتماعی، سیاسی اور معاشرتی نظام پر اعتماد مجروح ہوجاتا ہے اور اسلام دوسرے مذاہب کی طرح محض پوجا پاٹ کا مذہب بن جاتا ہے۔

ان کی فکر کا دوسرا جز سیاست اور ریاست کے حوالے سے اسلامی قوانین اور اسلامی تعلیمات کی نفی کرنا ہے اور ریاستی نظام کی تشکیل میں محض عقلیت اور سیکولرزم سے کام لینا ہے اور اس سلسلہ میں تاویلات وتوجیہات کے ذریعہ ماڈرن اسلام کی تیاری کی کاوشیں کرنا ہے۔

ان کا تیسرا فکری جز تزکیہ کی حامل شخصیتوں یعنی اہل اللہ کی اہمیت کا نہ صرف انکار کرنا ہے، بلکہ ان کے خلاف دشمنی کا مزاج پیدا کرنا ہے۔

تجدد پسندی کی حامل شخصیت

استاد وشاگرد کا کردار ایک نظر میں

پاکستان میں تجدد پسندی کی تحریک کے مختلف دانشور علمبردار رہے ہیں، تجدد پسندی کا مطلب نفس کو چاہنے والی جدید تہذیب کی بعض بنیادی چیزوں اور مظاہر کو اسلام سے ہمہ آہنگ بنانے کی کوشش کی جائے، تاکہ ان مظاہر کو اسلام کا حصہ سمجھکر اختیار کیا جائے اور اسلامی نقطہ نگاہ سے انہیں معیوب اور قابل نفرت سمجھنے کی روش ختم ہوجائے۔ مختلف ادوار میں ہمارے یہاں تجدد پسندی کی تحریک کے مختلف دانشور وعلمبردار رہے ہیں، پاکستان میں خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے علمی کام سے اس کا آغاز ہوا، موصوف ممتاز فلاسفر تھے، اقبال کے دوستوں میں شامل تھے، ملاازم کے موضوع پر ان کا کتابچہ بھی موجود ہے، فکر اقبال کے نام سے ان کی اہم کتاب ہے اور اقبال پر ان کے مضامین کے مجموعہ پر مشتمل غالبا دو تین حصوں پر مشتمل کتاب بھی ہے (آج سے ۳۵ سال پہلے راقم سطور نے ان کی ساری کتابیں پڑھ لی تھیں) وہ عورت کی آزادی کے قائل تھے، تاہم ان کے قلم سے مولانا رومی

کے حوالے سے بہت کام ہوا ہے، جوہر اعتبار سے قابل قدر ہے، ان کے یہاں تجدد پسندی کی فکر کے کچھ اجزاء تو موجود ہیں، لیکن وہ تجدد پسندی کی تحریک کے باقاعدہ علمبردار نہیں تھے، اس کے بعد ایوب خان کے دور حکومت میں فضل الرحمٰن صاحب جو حکومت کے ایک شعبہ کے سربراہ تھے، انہوں نے حکومت کی سربراہی میں تجدد پسندی کی فکر کو پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا، ان کی سخت مخالفت ہوئی، جس کی وجہ سے وہ پاکستان چھوڑ کر امریکہ چلے گئے۔

الطاف جاوید صاحب نے تجدد پسندی کے حوالے سے بڑا اہم منفی کام کیا ہے، انہوں نے جدیدیت سے ہمہ آہنگ اسلام کی نئی ایڈیشن کی تیاری پر آٹھ دس کتابیں لکھی ہیں۔ جواب بھی پڑھے لکھے افراد کے لئے بہت متاثر کن ہیں۔

اس وقت ہمارے ہاں تجدد پسندی کی تحریک کے سب سے بڑے علمبردار دانشور جاوید احمد غامدی صاحب ہیں، جسے اپنی فکر کو پھیلانے کے سلسلہ میں الیکٹرانک میڈیا کی سہولت حاصل ہے۔ مشرف کے دور حکومت میں ان کو تجدد پسندی کے طور پر سامنے لایا گیا تھا اور مختلف ٹی وی چینلوں سے ان کے روزانہ گھنٹوں پروگرام ہونے لگے تھے، جدید میڈیا کے ذریعہ ان کی فکر لاکھوں کروڑوں افراد تک پہنچنے لگی ہے۔ جاوید صاحب، تجدد پسندی کی فکر کو بغیر بھرپور مزاحمت کے نئی نسل میں پھیلانے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں، اس کے چار اسباب ہیں، ایک یہ کہ نوجوان نسل اسلامی اعتبار سے بالکل خالی ذہن ہے، وہ ذہنی طور پر اس طرح کی فکر کو سننے اور قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ دوم یہ کہ جاوید صاحب کا مطالعہ وسیع ہے اور ان کا اسلوب بیان نوجوان نسل کی ذہنی سطح کے بالکل ہمہ آہنگ ہے، اس کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ان کی گفتگو غیر جذباتی اور صبر وسنجیدگی کی حامل ہوتی ہے، وہ مزاج کے خلاف بڑے سے بڑے سوال کا تحمل سے جواب دیتے ہیں۔ اس کا چوتھا سبب یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں جاوید صاحب کی ذہنی وعلمی سطح اور غیر جذباتی اسلوب کے مقابلہ میں مذہبی طبقہ میں کوئی مؤثر شخصیت سامنے نہ آسکی ہے، جو ان کی اپنی زبان میں ان کی فکر کا توڑ سکے اور نئی نسل کو جدید اسلوب اور غیر جذباتی انداز میں قرآن وسنت کی سلف صالحین کی تشریح پر مطمئن کرسکے، مذہبی طبقہ میں جاوید صاحب کی فکر کو فروغ دینے میں ان کے شاگرد عمار یاسر صاحب بڑی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کے کام کو دیکھکر لگتا ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی اس فکر کو پروان چڑھانے میں صرف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

عمار یاسر صاحب، مولانا زاہدی الراشدی صاحب کے فرزند ارجمند ہیں اور حضرت

مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ صاحب کے پوتے ہیں۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب جدیدیت کے چیلنج کے فہم اور اس سلسلہ میں اپنے حصہ کے کردار کی ادائیگی کے معاملہ میں طبقہ علماء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ عمار یاسر صاحب کے دادا اہل سنت والجماعۃ کے قافلہ کے سالاروں میں شامل تھے، اتنی ممتاز دینی شخصیات کے خاندان میں نشوونما پانی والی شخصیت عمار یاسر صاحب نے جاوید احمد غامدی صاحب کی شاگردی اختیار کی، یہ شاگردی کیا اختیار کی کہ وہ انہی کے ہوگئے، اور ان کی فکر کے ترجمان بن گئے، اس فکر کے فروغ کی جدوجہد میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر ڈالنے کا عہد کر لیا، چنانچہ وہ لگ بھگ پچھلے ۱۵ سال سے یہ کردار ادا کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں موصوف ماہنامہ الشریعت رسالہ کو استعمال کر رہے ہیں اور الشریعت اکیڈمی کے تحت سالانہ دو دو ماہ کے جو علمی وفکری تربیت کے ورکشاپ ہوتے ہیں، جس میں مدارس کے فارغ طلبہ کو شامل کیا جاتا ہے، ان ورکشاپ کے ذریعہ علمائے کرام کی ذہن سازی کر کے، جاوید صاحب کی خدمت میں ان علماء کو بطور ہدیہ کے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح عمار یاسر صاحب طبقہ علماء کو جدیدیت کی فکری لہروں بلکہ اسلام کی جدید ایڈیشن کی تیاری اور تجدد پسندی کی تحریک کا حصہ بنا رہے ہیں۔

عمار یاسر صاحب اپنے استاد جاوید احمد غامدی صاحب کے لگ بھگ فکر کے سارے اجزاء کے پُر زور وکیل ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ برسوں تک مستند علماء سے درس نظامی پڑھتے رہے، جاوید صاحب کی شاگردی میں وہ اس کے مقابلہ میں کم عرصہ رہے، لیکن مستند علمائے کرام کی طویل عرصہ کی صحبت پر جاوید صاحب کی مختصر عرصہ کی صحبت ان پر زیادہ اثر انداز ہوئی، بلکہ ان کے وفکر ونظر کو تبدیل کرنے کا ذریعہ بنی۔

جاوید صاحب عقل کے ذریعہ قرآن سے مسائل اخذ کرنے کے علمبردار ہیں، جب کہ وہ اس سلسلہ میں احادیث اور سنت نبوی کو اسلام کا بنیادی ماخذی اور قانونی ذریعہ نہیں سمجھتے، البتہ وہ اپنے مقصد کی حامل احادیث کو ضرور استعمال کرتے ہیں، لیکن وہ احادیث کو شریعت کے دستور العمل کا حصہ نہیں سمجھتے، عمار یاسر صاحب بھی اپنے استاد کے اس بنیادی فکر کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اور احادیث کی بنیادی ماخذی حیثیت کو مجروح کرنے کے لئے الشریعت میں لمبے چوڑے مباحث شروع کر دیتے ہیں۔

جاوید صاحب، سیاست کو اسلام کا حصہ نہیں سمجھتے، نیز وہ سیاسی اسلام کے قائل نہیں، سیاست کو وہ سیکولر طبقات کی نذر کر دیتے ہیں۔ عمار یاسر صاحب بھی اپنی استاد کی اس فکر سے متفق ہیں۔ جاوید صاحب عورت ومرد کی آزادی ومساوات کے قائل ہیں، عورت صدر بھی بن سکتی ہے تو وہ چیف جسٹس بھی، عورت بغیر قریبی عزیز کے حج پر بھی جا

سکتی ہے۔ یاسر عمار صاحب کو اپنے استاد کی اس فکر پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔

جاوید غامدی صاحب، جہاد وقتال کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں، دنیا بھر میں مسلمان جہاں کہیں بھی اپنی بقا کی خاطر جہاد وقتال سے کام لے رہے ہیں، جاوید صاحب اسے صحیح نہیں سمجھتے، وہ اسلام کو ذاتی اصلاح تک محدود سمجھتے ہیں۔ یاسر عمار صاحب اپنے استاد کے اس موقف کے بھی قائل ہیں۔

جاوید صاحب سلف صالحین، بزرگان دین اور صوفیاء کرام کے سب سے زیادہ نقاد ہیں۔ صوفیاء کرام کی تردید وتکذیب ان کے فکر کے اہداف میں شامل ہیں، بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ دین اسلام کے لئے غلام احمد قادیانی سے زیادہ اصل خطرہ صوفیاء کرام ہیں، جنہوں نے اپنے کشف، کرامات، تصرفات اور روحانی مشاہدات کے ذریعہ ایک نئے دین کو جنم دیا ہے، یاسر عمار صاحب اپنے استاد کے اس فکر پر خاموش ہے، یہ خاموشی نیم رضامندی کی علامت ہے۔

جاوید صاحب موسیقی کے جواز کے قائل ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ موسیقی کے ذریعہ جنسی جذبات جس طرح بے قابو ہوتے ہیں، اس کی دوسری کوئی مثال ہی نہیں۔ عمار یاسر صاحب اپنے استاد کے اس موقف کے بھی مخالف نہیں۔ اس لئے کہ اس سلسلہ میں ان کی مخالفت الشریعت میں کم از کم اس عاجز کی نظر سے نہیں گذری۔

جاوید صاحب کی فکر کا ایک نکتہ یہ ہے کہ وہ حکومت سے کہتے ہیں کہ تعلیمی نظام میں جب تک بچہ بالغ نہ ہو، اس وقت تک اسے خالص سیکولر تعلیم دی جائے، مذہبی تعلیم ہرگز نہ دی جائے، اس لئے کہ مذہبی تعلیم دینے کے بعد ان کا ذہن مذہبی اعتبار سے راسخ ہو جائے گا، بالغ ہونے کے بعد اگر مذہبی تعلیم شروع ہو تو عقل کے ذریعہ دین ومذہب کی صحیح وغلط تعلیم میں فرق کرنے کی صلاحیت کا حامل ہوگا۔

جاوید صاحب کے اس فکری نکتہ کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعہ بچہ کی فطرت سلیمہ کو پوری طرح مسخ کر دیا جائے اور اسے خالص سیکولر ذہن وفکر ومزاج کا حامل بنایا جائے۔ بالغ ہونے کے بعد جب مذہب کا شعور ہی نہ ہوگا تو وہ ازخود سیکولر معاشرہ کا حصہ بنے گا، عمار یاسر صاحب نے اپنے استاد کے اس خطرناک فکری نکتہ کا کوئی تعاقب نہ کیا، غالباً وہ استاد کے اس نکتہ سے بھی متفق ہیں۔

جاوید صاحب اپنے خود ساختہ عقل اور لغت وعربی ادب کے ذریعہ قرآن کی ایک نئی تشریح کر رہے ہیں، جس کا سلف صالحین اور علمائے ربانیین کی تشریح سے کوئی تعلق نہیں، عمار یاسر صاحب اپنے استاد کی اس فکر سے نہ صرف متاثر ہیں، بلکہ وہ اس کے وکیل ہیں۔

ملک بھر کے ہر طرح کے علمائے کرام جاوید صاحب کی اس فکر کو گمراہ کن فکر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ متعدد علمائے کرام نے ان کا تعاقب کیا ہے اور اس سلسلہ میں کئی کتابیں سامنے آئی ہیں، جس میں حکمت، افہام وتفہیم اور دلائل سے جاوید صاحب کی فکر کو مسترد کردیا گیا ہے، اس کے باوجود عمار صاحب اپنے استاد کے فکر کے دفاع کا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ اور اپنے گہرے مذہبی خاندانی پس منظر سے فائدہ اٹھا کر، وہ نو عمر علماء کرام کو بھی اس گمراہ کن فکر کے جال میں پھانسنے کا کردار ادا کررہے ہیں۔

یہ تاثر پوری طرح صحیح نہیں کہ مولانا زاہد الراشدی صاحب اپنے فرزند کی اس فکر کی سرپرستی کررہے ہیں۔ بلکہ حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ کے کہنے پر انہوں نے اپنے فرزند کی سرپرستی نہ کرنے کا تاثر دیا تھا، اور ان کو سلف صالحین کی فکر سے وابستہ ہونے کی دردمندانہ تلقین بھی کی تھی۔

البتہ ہمیں حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب سے یہ شکوہ ضرور ہے کہ انہوں نے اپنے فرزند ارجمند عمار یاسر صاحب سے اس طرح کی لاتعلقی کا اعلان نہیں کیا، جو ان کے شایان شان تھی، بلکہ عدم سرپرستی کا تاثر دینے کے ساتھ ساتھ موصوف ایک طرح سے ان کی سرپرستی بھی فرماتے رہے۔ الشریعت رسالہ جو بنیادی طور پر حضرت مولانا کے فکر کا غماز تھا، اس رسالہ کو موصوف نے برسوں سے عملی طور پر عمار یاسر صاحب کے حوالے کردیا، اب بھی سرپرست کی حیثیت سے اس میں موصوف کا نام شامل ہے اور اس میں موصوف کے مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں۔ جس سے پڑھنے والے اس تاثر میں حق بجانب ہیں کہ حضرت مولانا موصوف بالواسطہ طور پر اپنے فرزند کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ الشریعت اکیڈمی کی طرف سے سالانہ علماء کرام کی فکری تربیت کے جو دو دو ماہ کے پروگرام ہوتے رہے ہیں،ان پروگراموں کی بیشتر ذمہ داری عمار یاسر صاحب کے حوالے کردی گئی، جس کی وجہ سے وہ اجتہاد اور تحقیق کے نام پر ورکشاپ میں شریک علماء کرام کی جاوید صاحب کی فکر کی بنیاد پر ذہن سازی کرتے رہے۔

ہمارے ایک غیر معمولی ذہین نوجوان ساتھی، جو ہمارے ساتھ تعلق کے وقت فکری بحران سے دوچار تھے۔ الحمدللہ ہماری کوششوں سے وہ اس فکری بحران سے نکلنے میں کامیاب ہوئے، اور صحیح اسلامی فکر سے وابستہ ہوئے تین چار سال پہلے وہ نوجوان الشریعت اکیڈمی کے فکری تربیت کے ورکشاپ میں دو ماہ تک شریک رہے۔ اب وہ ذہین نوجوان جاوید صاحب کی فکر کے پُرجوش وکیل ہیں، جاوید صاحب کی فکر کو فروغ دینا، اب ان کی زندگی کا ہدف بن چکا ہے، معلوم نہیں پچھلے پندرہ سال سے کتنے ذہین علماء ہوں

گے، جو عمار یاسر صاحب کی دوماہ کی محنت اور صحبت کے نتیجہ میں جاوید صاحب کی گمراہ کن فکر کی نذر ہوگئے ہوں گے۔ اس سلسلہ میں مولانا جیسی شخصیت سے جس احساس ذمہ داری کی توقع تھی، مولانا کی طرف سے اس کا مظاہرہ نہ ہوا۔

اس کا ایک دوسرا بڑا نقصان جو ہوا، وہ یہ کہ دینی طبقات میں مولانا کی مسلمہ شخصیت متنازع بن گئی۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے فرزند عمر احمد عثمانی نے ایک دور میں پرویزی فکر کی حمایت شروع کی تو حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے ان کی فکر کا سخت تعاقب کیا، اور ان کی فکر سے برأت کا اظہار فرمایا، عمار یاسر صاحب کے بارے میں بھی ہمیں مولانا کی شخصیت سے یہی توقع تھی۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب اس اعتبار سے ہمارے لئے سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ لگ بھگ پچھلے چالیس سال سے اسلام کے صحیح معاشی، معاشرتی، سیاسی اور فقہی مسائل کی تشریح اور جدید دور کی ضروریات میں اسلام کی رہنمائی کو جدید اسلوب میں صحافت کے محاذ پر مؤثر طور پر پیش کررہے ہیں اور دینی طبقات میں وہ واحد شخصیت ہیں، جو جدیدیت کے چیلنج کا علمی طور پر مقابلہ کررہے ہیں اور سیکولر طبقات کے ہر سوال کا بہتر طور پر رد کررہے ہیں، اس سلسلہ میں ان کے مضامین نہایت فکر انگیز ہوتے ہیں ''موصوف یہ کام آج سے نہیں'' کم وبیش چالیس سال سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ لیکن عمار یاسر صاحب کے سلسلہ میں ان کی طرف سے بہتر فیصلہ نہ ہونے کی وجہ سے دینی طبقات میں حضرت مولانا کی شخصیت کافی متنازعہ ہوگئی ہے، جو ہمارے لئے المیہ سے کم نہیں۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب سے دوستانہ مراسم ہونے کی بنا ہمیں یہ زیادہ استحقاق حاصل ہے کہ اس سلسلہ میں ہم عمار یاسر صاحب کے سامنے بھی دردمندی سے کچھ معروضات پیش کریں۔

ہمارا پہلا اہم نکتہ جسے عمار یاسر صاحب کو سامنے رکھنا چاہئے، وہ یہ ہے کہ زوال کے دور میں سلف صالحین کے فکری وعلمی واجتہادی سرمایہ سے چمٹے رہنا چاہئے، اس سرمایہ سے دستبرداری یا اس سرمایہ کے مقابلہ میں اپنے جیسے کسی عقل کے حامل دانشور کی تقلید اختیار کرنا شدید گمراہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اجتہاد، تحقیق اور نئے دور میں اسلام کی تشکیل نو کا کام ایسا ہے، جو اعلیٰ درجہ کی تقویٰ، سلف کی بنیادی تحقیقات پر گہری نظر، اللہ سے مستحکم تعلق، تبحر علمی اور علمائے زبانیین کی طویل عرصہ کی صحبت جیسی بہت ساری صلاحیتوں وصفات کی

متقاضی ہے، جو ہماشما کے بس کی بات نہیں، اتنا نازک کام ہاتھ میں لینا، انگاروں کو ہاتھ میں لینے کے مترادف ہے۔

دوسری اہم بات جو مجھے عرض کرنی ہے، وہ یہ ہے کہ بالخصوص زوال کے دور میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل جو کام ہے، جو فرد وافراد کے لئے موت وحیات کی حیثیت رکھتا ہے، وہ اپنی ذاتی اصلاح، نفسی قوتوں کے مکر وفکر کے ہزاروں واردات کو سمجھکر، ان کی بتدریج اصلاح وتزکیہ، مادیت کے بڑھتے ہوئے فتنوں سے بچاؤ، اللہ سے اپنے تعلق کا استحکام، اللہ سے والہانہ محبت اور اس محبت میں ارتقاء یہی وہ چیزیں ہیں جو سب سے پہلی ترجیح کا مستحق ہیں (یہ چیزیں اہل اللہ کی صحبت کے بغیر مشکل حاصل ہوتی ہیں) ان اہم چیزوں کو ذیلی اہمیت دے کر، اجتہاد وتحقیق کے نام پر سلف سے جداگانہ اسلامی فکر کی پیشکش کا کام نفس کا بہت بڑا دھوکہ ہے، جس سے بچنے کے لئے ہر ممکن حد تک کوشاں ہونا چاہئے۔

جاوید صاحب جیسے اہل عقل کے غور وفکر کے لئے

جاوید صاحب کے حوالے سے ایک بات جو عرض کرنی ہے، وہ یہ ہے کہ جدیدیت، آزاد خیالی اور ماڈرن ازم کا سیلاب اتنا تیز رفتار ہے کہ عقل محض اور الفاظ کے زیر وبم سیکھنے اور زبان ولغت میں مہارت، کتابوں کا کیڑہ بننے اور لفاظی مہارت سے مادیت کی ان طوفانی لہروں سے نہیں بچا جا سکتا، اس معاملہ میں بڑے سے بڑا علم بھی کارآمد ثابت نہیں، اس کے لئے ضرورت ہے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر، دل کو محبوب کے انوار حسن سے بہرہ ور کرنے سے، جب دل کے جذبات حسن اور احساسات حسن کی تشفی وتسکین ہوگی تو دل، حسن کے ان احساسات کے کچھ اجزاء عقل کی طرف بھی منتقل کرے گی، جس سے عقل آزادی، ماڈرن ازم، سلف وخلف کی تحقیر، جدیدیت پر فریفتگی، مادی مظاہر سے تاثیر پذیری، اسلام کی خواہشات نفس اور جدیدیت سے ہمہ آہنگ ایڈیشن کی تیاری کے کام، دوسرے اہل علم پر اپنی علمی

برتری جیسی چیزوں سے نہ صرف دستبردار ہوگی، بلکہ ان چیزوں سے فرد کا طبعی میلان بھی کمزور ہوگا، اس لئے کہ دل کے خزانوں سے فیضیابی کے بعد جدیدیت اور مادی تہذیب کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

یہ وہ راز ہے، جس راز کے سلف وخلف پوری طرح رازدان تھے، جس کی وجہ سے انہوں نے معاشرہ میں تعمیر واصلاح کا فریضہ سرانجام دیا، اللہ کی محبت کی شمع کو روشن کیا، لوگوں کی ظاہری وباطنی زندگیوں کو اسلام وایمان سے ہمہ آہنگ کیا، ان کی تربیت وتزکیہ کا کارنامہ سرانجام دیا، اس طرح اس راز سے آشنائی کی وجہ سے وہ ہم تک اسلام کے تسلسل کو پہنچانے کا ذریعہ بنے، جب کہ ہم جیسے دانشوروں کی حالت یہ ہے کہ ہم عقل اور تحریری وخطیبانہ صلاحیتوں کی بنا پر لوگوں کے نفس کو اتنا مشتعل کرنے لگتے ہیں کہ وہ تحقیق واجتہاد کے الفاظ رٹتے رہتے ہیں، جب کہ ان کی عملی زندگی جدیدیت پر فریب زدگی، قول وعمل کے تضاد، اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں دشواری، ذہنی وقلبی سکون سے محرومی، دل وعقل کے درمیاں شدید کشمکش سے عبارت ہونے لگتی ہے۔

ساتھ ساتھ ہماری حالت یہ ہے کہ چالیس پچاس مسلسل کام کرنے کے نتیجہ میں معاشرہ کو پاکیزہ کردار کے حامل چند افراد بھی فراہم نہ کر سکے، دل پر عقل وعقلیت کے غلبہ کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے، جو جاوید صاحب اور ہم جیسے افراد کے مسلسل کام کی صورت میں ظاہر ہوا ہے کہ سلف وخلف پر تنقید کے معاملہ میں تو تیز تر ہیں، لیکن تہذیب نفس، تزکیہ نفس اور ضبط نفس کے معاملہ میں صفر ہیں، یہ حالت زار عقلیت کو دل پر غالب کرنے کے بحران ہی کا نتیجہ ہے، اس نکتہ کو نظر انداز کرنے کا جو نتیجہ ظاہر ہوگا، وہ لاکھوں کی تعداد میں منفی اور بے عمل افراد پیدا کی صورت میں ہی ظاہر ہوگا، سوچنے اور سنبھلنے کی ضرورت ہے۔

فکر مودودی کے ردعمل کی اثرات سے بلند ہونے کی ضرورت

محترم جاوید احمد غامدی کی شخصیت کے تجزیہ سے معلوم ہوگا کہ وہ مولانا مودودی کی سیاسی اور غلبۂ اسلام کی فکر کے ردعمل میں دوطرفہ اثرات کے شدید زد میں ہیں۔ ایک تو اسلام کی سیاست اور ریاست سے متعلق تعلیمات یعنی اسلام کے سیاسی اور ریاستی نظام کے بارے میں شدیدابہام کا شکار ہیں، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاست اور ریاست کے بارے میں اسلام کی مستقل تعلیمات کے سرے سے قائل ہی نہ رہے، حالانکہ سیاست اور ریاست میں غلبہ دین کے بغیر ملت کی اسلامی زندگی بُری طرح متاثر ہوتی ہے، اور قوانین اسلام پر عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے ملت اللہ کے عتاب کا شکار ہوتی ہے نیز ریاستی نظام فاسد لوگوں کے ہاتھوں میں چلے جانے کی وجہ سے ملت ہمہ جہتی فساد سے دوچار ہوجاتی ہے۔

مولانا مودودی کے فکر کا دوسرا ردعمل جو ان کی شخصیت پر ہوا، وہ یہ کہ دین تو محض اللہ اور بندہ کے درمیان تعلق کا نام ہے۔ اس سے زیادہ دین کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس معاملہ میں جاوید صاحب، مولانا وحید الدین خان صاحب کی فکر سے متاثر ہیں، جو دین کو اصلاح نفس، عبادت، اور فکر آخرت تک محدود سمجھتے ہیں۔ اسلام کے سیاسی واجتماعی نظام کے بارے میں ان کی فکر میں گنجائش موجود نہیں، دین، جب محض انفرادی زندگی میں اللہ اور بندے کے درمیاں تعلق کا نام ہے تو اس کا لازمی نتیجہ سیکولر فکر کے غلبہ کی صورت میں ہی ظاہر ہوگا، چنانچہ غامدی صاحب کی طرح وحیدالدین خان بھی عقلیت، اور سیکولرزم کے حامی ہیں، ان دونوں کی فکر سے سیکولرزم کی فکر کو تقویت مل رہی ہے۔

ان دونوں کی یہ سیکولر فکر دراصل مولانا مودودی کی فکر کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ جاوید احمد غامدی صاحب ابتدا میں جماعت اسلامی کے رکن تھے اور ۱۹۷۰ء میں وہ

ذہانت کی وجہ سے مولانا مودودی کے پرائیویٹ سیکریٹری رہے۔ سید اسعد گیلانی صاحب (جو جماعت اسلامی کے پہلی سطح کے دوچار دانشوروں میں شمار ہوتے تھے) وہ اس زمانہ میں کہا کرتے تھے کہ جاوید احمد غامدی صاحب کو ضایع کرکے، ہم نے کافی نقصان اٹھایا ہے۔

جاوید صاحب کی طرح مولانا وحید الدین خان صاحب کی بھی ساری تعلیم وتربیت جماعت اسلامی کے ماحول میں ہوئی، اور آخر میں وہ جماعت کے شعبہ لٹریچر کی تیاری کے ذمہ دار تھے، ان دونوں نے جب جماعت کے فکری سانچہ میں سیاسی فکر کے غیرمعمولی غلبہ اور دین کی اصلاحی اور مذہبی حیثیت کو مجروح ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ ردعمل میں دین کے توازن کو تھامنے میں ناکام ہوئے، توازن کے فقدان اور غیرمعمولی ذہانت نے ایک طرف تو انہیں سلف وخلف پر اپنی شخصیت کو برتر ثابت کرنے کی راہ پر گامزن کیا اور سلف وخلف کی مخالفت کی راہ پر لگایا، دوسری طرف انہیں عقلیتِ محض پر اعتماد کرنے پر مجبور کیا اور عقلیت نے انہیں سیکولرزم کی راہ دکھائی، اس طرح یہ دونوں بالواسطہ طور پر عالمی سرمایہ دار کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔

مولانا مودودی نے جس دور میں نشوونما پائی، اس دور میں فضا میں نظامہائے زندگی کی گونج دی، فرانسیسی انقلاب کے بعد پورا یورپ تبدیلی کی زد میں رہا اس کے بعد سوویت یونین میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا۔

چنانچہ جدید تعلیم یافتہ افراد جو تیزی سے مغربی سیکولرزم اور کمیونسٹ نظام کی طرف جارہے تھے، ان کو ان فکری اثرات سے بچانے کے لئے اسلام کو بھی ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرنے اور اس کے ریاستی وسیاسی پہلو پر زیادہ زور کی ضرورت تھی، اس وقتی مجبوری اور اہل تصوف سے عدم استفادہ کی وجہ سے مولانا مودودی دل اور روح کی نزاکتوں اور ہولناک نفسی قوتوں کے مدوجزر سے

ناآشنائی کی بنا پر اپنی فکر میں اصلاح نفس کے کام کو قابل ذکر اہمیت نہ دے سکے، جس کی وجہ سے ایک طرف تو جماعت سے وابستہ افراد کی تعمیر سیرت کا کام متاثر ہوا، دوسری طرف جماعت سے وابستہ جاوید صاحب اور وحید الدین خان جیسی ذہین شخصیتوں میں اضطراب پیدا ہوا اور اصلاح نفس کی خلا محسوس ہوئی، اس خلا کو پُر کرنے کی صورت اہل اللہ کی صحبت ہی تھی، نہ کہ عقلیت کو تیز سے تیز تر کرنا۔

جاوید صاحب کو ہمارا مخلصانہ ومحبانہ مشورہ ہے کہ وہ مولانا مودودی کے فکری ردعمل کے اثرات سے بلند ہوکر، فکری توازن کا مظاہرہ فرمائیں، ورنہ ان کی ذہانت سے ہزاروں نہیں، لاکھوں افراد اسلام کے نام پر جدیدیت اور ماڈرن ازم کا شکار ہوں گے اور آخرت میں ان لاکھوں افراد کی فکری وعملی کجی کا حساب دینا ان کے لئے ممکن نہ ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میری امت کبھی بھی گمراہی پر متفق نہ ہوگی اور ہر دور میں امت کا ایک طبقہ حقیقی اسلام پر قائم رہے گا اور اسے نقصان پہنچانے والے نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

جاوید صاحب کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ۱۴ سو سال میں اسلام کو پہلی مرتبہ انہوں نے سمجھا ہے، یہ سب علمی زعم اور فریب نفس کی باتیں ہیں۔ ہم انہیں مخلصانہ طور پر دعوت دیتے ہیں کہ وہ سلف کے اسلام کی طرف واپس آجائیں، جس کے لاکھوں علماء کرام اور فضلا عامل وحامل رہے ہیں۔

دجالیت کا بڑھتا ہوا فتنہ

اور اس سے بچاؤ کے لئے کوششوں کی ضرورت

اس وقت دجالی تہذیب کے علمبردار جس میں امریکی حکمران، وہاں کی اسمبلی ممبران، عالمی سرمایہ دار، امریکی اخبارات اور میڈیا سے وابستہ افراد، سائنسدان اور ماہرین سب اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ انسانیت کو دنیا کا سب سے بدتر حیوان بنایا جائے، انہیں

اپنی تہذیبی غلامی کی زنجیروں میں کسا جائے، مسلمانوں کے خلاف ہر طرف سے آگ برپا کردی جائے، دنیا کی مختلف قوموں میں مسلمانوں کے خلاف عصبیت پیدا کرکے، انہیں بڑے پیمانہ پر قتل کرنے پر ابھارا جائے، جدید سائنسی اور ٹیکنالوجی ترقی کے ذریعہ فضا سے زمین پر ایسے نقشوں، تصویروں اور آوازوں کا جادو جگایا جائے، جس سے ظہور ہونے والے دجال کی خداوندی کو قبول کرنے اور اسے معبود بنانے کے لئے فضا ہموار ہو۔ اس طرح ایک نئے مصنوعی خدا کا سکہ جمایا جائے، چونکہ یہ دجال یہودیوں میں سے ہوگا، اس لئے اس سے دنیا میں یہودیوں کی عالمی حکومت کے قیام کے لئے فضا ہموار ہوگی، اس سلسلہ میں جو پیش رفت ہوئی ہے، اس کا اندازہ ایک مضمون سے لگایا جا سکتا ہے، جو ایک مشہور مضمون نگار مفتی ابولبابہ صاحب نے لکھا ہے، یہاں اس مضمون کے ایک اقتباس پر اکتفا کی جاتی ہے۔

''نیو ورلڈ آرڈر دراصل اس شیطانی مذہب یا دجالی نظریے کی تمام دنیا پر تنفیذ کا نام ہے، جس میں تمام انسانوں کا ایک مصنوعی خدا، ایک غلامانہ مذہب اور ساتوں براعظم کا ایک طرز زندگی ہوگا۔

اس نظام کو مکر اور جبر کے ذریعے نافذ کیا جائے گا۔ جو ''ہولوگرام ٹیکنالوجی'' کو سمجھ کر دھوکے میں نہ آئیں، ان پر جبر ہوگا اور جو اس دھوکے کو نہ سمجھ سکیں (اور اکثریت انہی کی ہوگی) ان کے ساتھ مکر وفریب ہوگا۔ کہیں شعبدہ بازی اور بازی گری کے ذریعے یہ نیا عالمی دستور نافذ کیا جائے گا اور کہیں دھونس دھاندلی کے بل بوتے پر تھوپا جائے گا۔ امریکہ ویورپ نے اپنی ایجادات سے انسان کو فروعی گناہوں میں جو آسانی فراہم کی وہ تو کی، اب عقیدے اور نظریے کی وہ تباہی اور بربادی بھی پھیلائیں گے، جو ناسا کے مراکز میں تیار ہورہی ہے۔ دنیا کو آہستہ آہستہ ''ہارپ ٹیکنالوجی'' کے بعد ''ہولوگرام ٹیکنالوجی'' کے ذریعے آسمان سے غیبی آوازیں آئیں گی۔ بادلوں میں فرشتے دکھائی دیں گے۔ جنت کے بالا خانے اور جہنم کی کھائیوں کا نظارہ کروایا جائے گا۔ آسمان پر ایک بڑی اسکرین دنیا کے ہر شہر میں دکھائی دے گی۔ جہاں سے اس دنیا کا نیا خدا اپنی مصنوعی خدائی کو تسلیم کروانے کے لیے پہلا حکم دے گا۔ اس حکم کا دنیا کی تمام زبانوں میں بیک وقت ترجمہ ہورہا ہوگا۔ ہر ملک اور ہر شہر کے باسیوں کو وہ ان کی اپنی زبان میں بولتا دکھائی دے گا۔ پھر اس کے زمینی کارندے حرکت میں آجائیں گے۔ وہ پانی کو آگ اور آگ کو پانی دکھائیں گے۔ کھیت کو صحرا، برفانی پہاڑ کو آتش فشاں اور سراب کو سمندر بتائیں گے۔ دجالی مذہب

کے صہیونیت زدہ پیروکار انسانوں کو ایک کھوٹے اور جھوٹے انسان کی خدائی مان لینے پر اکسائیں گے۔ شیطنت اس قدر عروج پر ہوگی کہ لوگ سچے مسیح کو آسمان سے اترتا دیکھ کر نہ مانیں گے اور جھوٹے مسیح کی شبیہ بادلوں میں دکھائی جائے گی تو سجدے میں گر پڑنے پر تیار ہوجائیں گے۔ سچا مہدی شریعت وسنت کی اتباع کی طرف بلائے گا، حرام خوری اور حرام کاری کے عادی حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتائیں گے۔ جھوٹے مہدی شعبدے دکھا دکھا کر لوگوں کے ایمان سے کھیلیں گے، ان کے فریب کا پردہ چاک کرنے والے کو لوگ جھٹلانا شروع کردیں گے۔''

یہ حالات ایسے ہیں، جو مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کے لئے اتنے زیادہ تشویشناک نہیں، اس لئے کہ زندگی کے بارے میں ان کا نقطہ نگاہ خالص مادی نوعیت کا ہے یا شرک پر مشتمل ہے، چنانچہ ان قوموں کی نظر میں اگر یہ سب کچھ ہوتا ہے تو اس سے ان کی صحت، ان کی مادی تہذیب اور ان کے مشرکانہ مذہب پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن توحید ورسالت پر عقیدہ رکھنے والوں کے لئے یہ صورتحال زندگی اور موت کی سی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے کہ اس سے ان کی ابدی زندگی خطرہ سے دوچار ہوگی اور مصنوعی خداوندی کی دعویدار شخصیت اور اس کے کروڑہا حامیوں کی پیدا کردہ فضا کہ وجہ سے ان کا حقیقی خدا پر اعتماد ختم ہوگا اور وہ سائنسی وٹیکنالوجی ترقی کے نتیجہ میں ظاہر ہونے والے مصنوعی واقعات کو حقیقت سمجھکر، دجال اور دجالی تہذیب کے فریب میں آکر اپنے عقیدے سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوں گے۔ چونکہ علم، معلومات اور معیشت وغیرہ کے سارے ذرائع دجالیت کے پاس ہوں گے اور دینی ومذہبی حوالے سے افراد کی اکثریت کی معلومات صفر کے برابر ہوگی، اس لئے وہ دجالیت کے ہولناک فتنہ کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکیں گے، حدیث شریف میں ہے کہ اس وقت معاشی خوشحالی کے ذرائع دجال کے قبضہ میں ہوں گے، وہ جسے چاہے گا، مادی طور پر خوشحال بنائے گا اور جسے چاہے گا بھوکوں مارے گا۔ اس وقت کے حالات کے بارے میں مزید تصویر کشی فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگ صبح کو اسلام پر قائم ہوں گے، تو شام کو کفر میں داخل ہوں گے۔ شام کو اسلام میں ہوں گے تو صبح کو اسلام سے نکل جائیں گے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے مسلمان اپنی اولاد کو تاکید کریں گے کہ وہ دجال کے پاس نہ جائیں، لیکن وہ دجال کے پاس جائیں گے، جس سے وہ ان کے طلسموں سے متاثر ہوکر ایمان ضایع کریں گے، ان حالات میں

ضرورت ہے کہ دجالیت اور دجالی تہذیب کے علمبرداروں کے پیدا کردہ سارے فتنوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے اور مسلمانوں کو ایمان پر قائم رکھنے کی ہر ممکن حد تک کوششیں کی جائیں۔

مادیت پرستی کی ہمہ گیر فضا کی وجہ سے اس وقت خود مسلمانوں میں بے حسی، بے حمیتی اور اپنے ایمان کے تحفظ کے لئے مدافعانہ تدابیر کی فکر نہ ہونے کے برابر ہے، آنے والے حالات میں اس میں مزید اضافہ ہوگا، تاہم حساس اور دردمند افراد کا کام ہے کہ وہ اس سلسلہ میں آخری حد تک اپنے کردار کی ادائیگی کے لئے کوشاں ہوں۔

ہماری نظر میں دجالیت کے فتنہ سے بچاؤ کی سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ مسلمانوں میں مادی زندگی پر فریفتگی کی جو صورتحال پیدا ہوگئی ہے، اس فریفتگی کو ختم کیا جائے اور معاشی ضروریات کے اعتبار سے اللہ کی ذات پر بھروسہ کرنے کی فضا پیدا کی جائے اور انہیں اللہ کے ساتھ تعلق مستحکم کرنے اور اللہ سے محبت کی راہ پر گامزن کرنے کی کوشش کی جائے، اس لئے کہ دجالیت کا جادو انہی لوگوں پر اثر کرے گا، جو اللہ سے تعلق اور اس سے محبت کے معاملہ میں کمزور ہوں گے اور جو دنیاوی زندگی پر فریفتہ ہوں گے۔ اس وقت بدقسمتی سے مسلمانوں میں عمومی طور پر یہی فضا پیدا ہوچکی ہے، اسے بدلنے کے لئے سخت محنت کی ضرورت ہے۔

مال ودولت کی محبت

اور اس کے نقصانات کا جائزہ

شخصیت کی تعمیر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مال ودولت کی محبت ہے، اس دور میں یہ چیز بہت بڑے بت کر صورت میں سامنے آئی ہے، جس کی سب سے زیادہ پوجا ہونے لگی ہے۔

مال اور دولت ایسی چیز ہے، جس سے عام طور پر فرد آپے میں نہیں رہتا، مزاج میں خلل، بلکہ فساد واقع ہونے لگتا ہے، عام لوگوں اور صاحب مال فرد کے درمیاں حجابات پیدا ہوجاتے ہیں۔ فرد میں بڑے پن کی نفسیات پیدا ہوجاتی ہے، سوچ میں اعتدال باقی نہیں رہتا، حرص وہوس کے جذبات غالب ہونے لگتے ہیں،

مال سے مزید مال بنانے کی جنون کی حالت پیدا ہونے لگتی ہے، روح کے تقاضوں پر مادی تقاضے غالب ہونے لگتے ہیں۔ عام لوگوں کو حقیر سمجھنے کی نفسیات جنم لینے لگتی ہے، خیر کی توفیق خاص طور پر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی توفیق سلب ہونے لگتی ہے، غریب لوگوں پر رحم کا جذبہ مدھم ہونے لگتا ہے۔ مال، نفس کو بُرائیوں پر اکسانے کا بھی موجب بننے لگتا ہے، قومی اور ملی کاموں اور ملت کے موت وحیات کے مسائل سے دلچسپی باقی نہیں رہتی، فرد مال پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے، غریب عزیز واقارب کی مالی مدد کرنے کا جذبہ مدھم ہوجاتا ہے، بلکہ ان سے تعلقات منقطع ہونے لگتے ہیں، اس لئے تاکہ تعلقات سے کہیں وہ اپنی بیماری ومصائب کے حوالے سے پیسہ مانگنے نہ لگیں، مال سے سنگینی وقساوت قلبی کی بیماری پیدا ہونے لگتی ہے، فرد ہر چیز کو پیسے کے پیمانے سے ناپنے لگتا ہے۔شان وشوکت کی زندگی وتیرہ بن جاتی ہے اور بڑی گاڑی، بڑا بنگلہ اور راحت وآسائش کے ہر سامان کی چاہت بڑھ جاتی ہے۔ دولت پر مرمٹنے کی وجہ سے تفکرات پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس کی حفاظت کی فکرمندی سے نیند اڑ جاتی ہے، دولت میں کمی یا کاروبار میں نقصانات کا تصور ہی فرد کے لئے شدید اذیت بلکہ بیماری کا باعث بننے لگتا ہے۔ آخرت کی فکر اور اس کی تیاری سے غفلت غالب ہونے لگتی ہے، دل، دولت دنیا میں اٹک جاتا ہے۔

اللہ کی راہ میں دولت خرچ کرنے کا تصور بھی سوہان روح بن جاتا ہے۔ اول تو عبادت وفرائض سے تعلق باقی نہیں رہتا، اگر رہتا بھی ہے تو وہ رسمی نوعیت کا ہوتا ہے، فرد، بُرائیوں سود، شراب، زنا وغیرہ کی دلدل میں پھنسنے لگتا ہے۔عقل میں فساد برپا ہونے لگتا ہے۔نصیحت کی باتیں اثر انداز نہیں ہوتی، دل مردہ ہوجاتا ہے۔

یہ کتنے بڑے نقصانات ہیں، جو مال اور دولت کی کثرت سے پیدا ہوجاتے ہیں، دولت کی ان ساری خرابیوں کا مشاہدہ ہونے کے باوجود یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ لگ بھگ ہر فرد زیادہ سے زیادہ دولت بنانے کی فکر میں رہتا ہے، اور جائز وناجائز

ہر طریقہ سے دولت بنانے لگتا ہے۔ جن کو مواقع میسر نہیں ہوتے، وہ دولت کے ارمان اور فکر میں گھل جاتے ہیں۔

دولت سے محبت کی یہ ساری صورتحال دراصل باطنی زندگی میں موجود ایک زبردست خلا سے پیدا ہوتی ہے، وہ خلا یہ ہے کہ شخصیت لازوال حسن کا مشاہدہ چاہتی ہے اور اس کے لئے وہ پیچ تاب کھاتی رہتی ہے، جب انسان کی اصل شخصیت کے اس زبردست داعیے (تقاضے) کی تکمیل وتسکین کی صورت پیدا نہیں ہوتی، نفس امارہ فرد کو مال کی صورت میں ان کی شخصیت میں موجود اس خلا کو پُر کرنے کی راہ پر گامزن کرنے لگتا ہے۔ جو عملاً ممکن نہیں، اس کے نتائج وہ نکلتے ہیں جس کا اوپر ذکر ہوا۔

جہاں تک بنیادی ضروریات کی حد تک مال کمانے کی جدوجہد کا تعلق ہے وہ تو دینی اعتبار سے ایک فریضہ ہے، تاکہ فرد اپنی اور بال بچوں کی ضروریات کو پورا کر سکے، لیکن عملاً ایسا نہیں ہوتا، بلکہ فرد کو مال کی محبت حد اعتدال میں قائم رہنے نہیں دیتی، اور اس کی ساری صلاحیتوں اور ساری فکری توانائیوں کو مال جمع کرنے کے لئے خرچ کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔

مال کی ان خرابیوں کو دیکھکر اللہ کے رسولوں، بزرگان دین اور خود جدید نفسیات نے اس کی المناکیوں کی نشاندہی کی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ مالدار کا خدا کی خدائی میں شامل ہونا ایسے ہے جیسے اونٹ کا سئی کے ناکے میں داخل ہونا، حضورﷺ کا فرمان ہے کہ دنیا کی محبت ساری بُرائیوں کی جڑ ہے۔

ایک بزرگ حضرت فضیلؒ بن عیاذ کا کہنا ہے کہ مجھے اگر ساری دنیا کی دولت دیدی جائے اور یہ فرمایا جائے کہ تم سے اس کا کوئی حساب نہیں لیا جائے گا تو مجھے یہ مال قبول نہیں، اس لئے کہ مال کی یہ بُرائی کوئی کم نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ کی

طرف توجہ میں کمی واقع ہوتی ہے اور اللہ کا ذکر متاثر ہوتا ہے۔

اکابر بزرگان دین کی ملفوظات وتعلیمات مال کی مذمت اور خرابیوں سے بھری ہوئی ہیں۔

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی فرماتے ہیں: طالب، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، سب کو دل نکال دے، ورنہ ہزار برس تک بھی ذکر وشغل کرے گا تو کام نہ آئے گا۔ دل آئینہ ہے اس کو غیر اللہ کے عکس سے بچانا چاہئے۔ عزت ورتبہ کی خواہش جو گمراہی ہے، اس سے پناہ مانگنی چاہئے۔ (تسہیل قصد السبیل صفحہ ۴۵)

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ بزرگی کے روپ میں ذلیل دنیا کی چاہت ایسی چیز ہے، جو بزرگی کے لئے دھبہ ہے۔

جدید نفسیات نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے، عبدالماجد دریابادی جو ابھی مولانا نہیں بنے تھے اور جدید فلاسفر تھے اور سیکولر فکر کے حامل تھے، انہوں نے ۱۹۱۶ء میں ''فلسفہ جذبات'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، اس میں لکھتے ہیں ''جدید نفسیات کہتی ہے کہ چار طبقات ایسے ہیں، جن کے اندر بڑی پن کی نفسیات پختہ ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے ان کی اصلاح سب سے زیادہ دشوار ہوتی ہے وہ چار طبقات یہ ہیں، ایک سرمایہ دار ومالدار دوسرے حکمران وآفیسر، تیسرے دانشور وفلاسفر، چوتھے عابد وزاہد، چونکہ یہ سارے طبقات دولت، عزت، شہرت، علم، ذہانت عبادت وزہد وغیرہ کو اپنی ذات کا بنیادی حصہ شمار کرتے ہیں، اس لئے وہ عام طور پر تکبر کی نفسیات میں مبتلا ہوجاتے ہیں، وہ علم فضل وغیرہ کو اپنی ذات میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ان پر عام طور پر اصلاح کی بات کارگر نہیں ہوتی۔

آدم اسمتھ جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے بانی مفکر شمار ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ سرمایہ داروں کی شادی وغمی کی تقریبات میں شرکت بھی عام لوگوں پر مہنگائی مسلط کرنے اور ان سے دولت چھیننے کی سازشوں میں صرف

ہوجاتی ہے۔

دولت شروع میں ضرورت کی صورت میں سامنے آتی ہے، لیکن چونکہ دولت کی محبت لاشعور میں موجود ہوتی ہے، اس لئے کلرک ہو یا ہنرمند، چھوٹا تاجر ہو یا چھوٹا صنعتکار، سیاسی کارکن ہو یا حکمران وآفیسر، جب انہیں ایک بار دولت کمانے کے مواقع میسر آتے ہیں تو وہ ان مواقع کو ضایع ہونے نہیں دیتے، دولت کی محبت انہیں کروڑپتی اور ارب پتی بننے پر مجبور کردیتی ہے۔ جب سازگار مواقع کی وجہ سے ہر فرد اس دوڑ میں شریک ہوجائے تو ظاہر ہے، معاشرہ فساد سے دوچار ہونے لگتا ہے، ارتکاز دولت کی وجہ سے عام لوگ پس کر رہ جاتے ہیں۔

موجودہ سرمایہ داری نظام نے تو دولت کی محبت کی خرابیوں اور فساد کو اتنا واضح کردیا ہے کہ انسانیت ماتم کدہ ہے۔

اس معاملہ میں حداعتدال میں رہنے اور دولت پرستی کے رنگ کو غالب نہ دینے کی صورت ایک ہی ہے کہ فرد فطرت میں موجود اللہ کی محبت کے رنگ کو اپنے اوپر غالب کرنے کے لئے ذکر وفکر کے مجاہدوں سے کام لے، یہ مجاہدے دولت کے محبت کو کم سے کم کرنے اور انسانیت کا درد پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

دنیا ودولت
اللہ کے رسول اللہ ﷺ کی نظر میں

دنیا کی محبت اور دنیاداری کے سلسلہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محبت آفت ہے آفت، اس سے فرد میں جتنی بھی بُرائیاں پیدا ہوں، کم ہے، یہی دولت، خونی رشتہ کے افراد کو ایک دوسرے سے متصادم کراتی ہے، یہی دولت فرد میں آخری حد تک سنگ دلی پیدا کردیتی ہے کہ لوگ بھوکوں مررہے ہوتے ہیں، لیکن سرمایہ دار اناج کے دام گرنے سے بچانے کے لئے اناج کو سمندر میں خردبرد کرنے یا ذخیرہ اندوزی کے لئے تو تیار ہوجاتا ہے، لیکن

لوگوں کو بھوکا مرنے سے بچانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔

ذیل میں اس سلسلہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی کچھ احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

آپ نے فرمایا: جو شخص دنیا کو اپنا محبوب ومطلوب بنائے گا، وہ اپنی آخرت کا ضرور نقصان کرے گا اور جو کوئی آخرت کو محبوب بنائے گا، وہ اپنی دنیا کا ضرور نقصان کرے گا، فنا ہوجانے والی دنیا کے مقابلہ میں باقی رہنے والی آخرت کو اختیار کرو۔

فرمایا: خبردار دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، اس پر اللہ کی پھٹکار (لعنت) ہے اور اس کے لئے رحمت سے محرومی ہے، سوائے اللہ کے ذکر کے اور ان چیزوں کے جن کا اللہ سے کوئی تعلق ہے اور سوائے عالم ومتعلم کے (جامع ترمذی)

فرمایا: کوئی ایسا ہے کہ پانی پر چلے اور اس کے پاؤں نہ بھیگیں؟

عرض کیا گیا: حضرت! ایسا تو نہیں ہوسکتا، آپ نے فرمایا: اسی طرح دنیا دار گناہوں سے محفوظ نہیں ہوسکتا۔ (شعب الایمان للبیہقی)

فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو دنیا سے اس کو اس طرح بچاتا ہے، جس طرح کہ تم میں سے کوئی اپنے مریض کو پانی سے بچاتا ہے (جب کہ اس کو پانی سے نقصان پہنچتا ہو)۔

فرمایا: میں اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ جن بلاؤں سے ڈرتا ہوں ان میں ایک خواہشات ہیں دوسرے دنیوی زندگی کے بارے میں لمبی لمبی امیدیں۔ (البیہقی)

فرمایا: مجھے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تم پر فقر اور ناداری آئے گی، بلکہ مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ تم پر دنیا وسیع کردی جائے گی جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر وسیع کی گئی تھی پھر تم اس کو بہت زیادہ چاہنے لگو گے، جیسے کہ انہوں نے اسے بہت زیادہ چاہا تھا، اور پھر یہ دنیا تم کو برباد کردے، جیسے انہوں نے اگلوں کو برباد کیا۔ (صحیح بخاری ومسلم)

فرمایا: آدمی بوڑھا ہوجاتا ہے، مگر اس کے نفس کی دو خصلتیں اور زیادہ جوان اور طاقتور ہوتی رہتی ہیں، ایک دولت کی حرص دوسری عمر کی زیادتی کی حرص۔ (بخاری ومسلم)

فرمایا: جس شخص کی نیت اور اس کا مقصد اپنی سعی وعمل سے آخرت کی تیاری ہو تو اللہ تعالیٰ اسے غنا (یعنی قلبی اطمینان اور مخلوق کی عدم محتاجی کی کیفیت) اس کے دل کو نصیب فرمائیں گے اور اس کے پراگندہ حال کو درست فرمائیں گے اور دنیا اس کے پاس خود بخود ذلیل ہوکر آئے گی۔ (ترمذی شریف)

فرمایا: دنیا کا بندہ اللہ کی رحمت سے دور ہو اور درہم کا بندہ اللہ کی رحمت سے دور ہو۔ (ترمذی)

فرمایا: جو شخص بھوکا ہو، یا اس کو کوئی خاص ضرورت درپیش ہو، اور وہ اپنی بھوک اور ضرورت کو لوگوں سے چھپائے تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے کہ اس کو حلال طریقہ سے ایک سال کا رزق عطا فرمائے۔ (البیہقی)

فرمایا: جو بندہ بھی زہد اختیار کرے (یعنی دنیا کی رغبت وچاہت اپنے دل سے نکال دے) تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت کو اگائے گا اور اس کی زبان پر بھی حکمت کو جاری کرے گا اور دنیا کے عیوب اور اس کی خرابیاں اور اس کا علاج ومعالجہ بھی اس پر ظاہر کردے گا۔ اور دنیا سے اس کو سلامتی کے ساتھ نکال کر جنت میں پہنچائے گا۔ (البیہقی)

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کو یمن کی طرف روانہ کیا تو نصیحت فرمائی کہ معاذ (رضی اللہ عنہ) آرام طلبی اور راحت سے بچتے رہنا، اللہ کے خاص بندے آرام طلبی اور راحت نہیں کیا کرتے۔ (مسند احمد)

رسول اللہ ﷺ کی اپنی پاکیزہ زندگی ان احادیث مبارکہ کا کامل نمونہ تھی، بزرگان دین نے بھی ان احادیث کے مطابق زہد وفقر کو اپنا وتیرہ بنایا تھا، فقر کی زندگی انہیں اتنی محبوب تھی کہ اس سے وہ کسی قیمت پر دستبردار ہونے یا مفاہمت کے لئے تیار نہیں تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی ان احادیث کی اہمیت موجودہ دور میں اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ عالمی سرمایہ داری نظام کے تحت انسان کی کل حیثیت معاشی حیوان کی سی رہ گئی ہے، ہر وہ فرد جو مارکیٹ کے اعتبار سے افادیت کا حامل نہیں ہے، اس کی قدر قیمت اور وقعت ختم ہوگئی ہے اور وہ اس قابل ہے کہ اسے پامال کیا جائے اور اس سے زندہ رہنے اور زندگی کا حق سلب کردیا جائے، فرد کا معیار عزت علم، تقویٰ، اور نیکی نہیں، بلکہ دولت بن کر رہ گئی ہے۔

جو سرمایہ دار کے تیار کردہ مال کی خرید وفروخت اور اس کی دولت میں اضافہ کا ذریعہ نہیں بنتا اور جو معاشی تگ ودو کی صلاحیت سے قاصر ہے، وہ معاشرے میں حقیر تر حیثیت کا حامل ہے۔

اللہ کے رسول کی ان احادیث کی رُو سے حب مال اور آخرت کی قیمت پر دولت کا حصول اور دولت کو عزت کا معیار سمجھنا، یہ مسترد ہے، دولت کی ایسی زندگی فرد کو اللہ کی لعنت کا مستحق بنالیتی ہے، دولت ودرہم کا بندہ رسوا ہو، لیکن جہاں تک جائز ضروریاتِ زندگی کے حصول کا تعلق ہے تو ایسی معاشی جدوجہد دینی فرائض میں شامل ہے، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو جائز معاشی جدوجہد میں پسینہ بہاتے ہوئے دیکھکر خوش ہوتا ہے۔ چونکہ یہ جداگانہ موضوع ہے، جو بہت زیادہ تفصیل چاہتا ہے، اس کی مزید تفصیل ہماری کتاب ''انسانی شخصیت میں نصب بت'' میں موجود ہے، یہاں اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

مجاہدوں سے حقائق و معارف کا حاصل ہونا

ذکر وفکر کے مجاہدے، حقائق ومعارف اپنے ساتھ لاتے ہیں، حقائق ومعارف کا مطلب تقویٰ، حکمت، بصیرت، فراست، معرفت، نورایمان، صبر وشکر، رضا بالقضا، اللہ اور آخرت کا دھیان جیسی خصوصیات جن کا قرآن واحادیث میں ذکر کیا گیا ہے، ان صفات سے بہرہ وری ہے اور نفس پر روح کے غلبہ کی وجہ سے روح کی پرواز کا

بلند ہوجانا ہے، اس سے مادی دنیا کی گرفت کمزور ہونے سے فرد کی سیرت وکردار میں پاکیزگی پیدا ہوجاتی ہے اور ''احسان'' کا ملکہ راسخ ہونے لگتا ہے اور آخرت کے منظر کی دل پر عکس ریزی ہونے لگتی ہے، حقائق ومعارف حاصل ہونے سے فرد کی قرآن وسنت کی روح تک رسائی ہونے لگتی ہے، اگرچہ علم زیادہ نہ ہو، لیکن عمل کی صلاحیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

حقائق ومعارف کے حصول کی یہ نعمت اتنی بے بہا نعمت ہے کہ اس کے لئے جتنے بھی مجاہدے کرنے پڑیں اور نفس کو جتنی بھی گھاٹیوں سے گزارنا پڑے، سستا سودا ہے، سبب یہ ہے کہ مجاہدوں سے روح کی دنیا، آخرت کی دنیا اور محبوب کے مشاہدہ کی دنیا کی راہ میں حائل دشواریاں دور ہوجاتی ہیں اور ایمان ویقین کی حالت مستحکم ہوجاتی ہے اور فرد بڑے سے بڑے واقعات، حالات اور حادثات سے متاثر اور متزلزل نہیں ہوتا، اللہ نے اپنے ذکر وفکر اور راہ محبت کے مجاہدوں میں یہ ایسی تاثیر رکھی ہے، جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، یہ نعمت انہی خوش نصیب افراد کو حاصل ہوتی ہے، جو آتش عشق میں جلنے کے لئے تیار ہوں، اس طرح وہ ایک زندگی کی قربانی دے کر، سونئی زندگیاں حاصل کرتے ہیں۔

نت نئے مسائل کے شکار انسان کی حالت زار

جدید انسان، پاکیزہ بنیادوں پر تعمیر انسانیت سے محرومی کی وجہ سے نت نئے مسائل کا شکار ہے، یہ مسائل اتنے سنگین ہیں کہ اس کی وجہ سے اس کی زندگی خطرات سے لاحق ہوگئی ہے، نیز اس کی زندگی کی کوئی کل درست نہیں رہی، وہ اپنے سارے مسائل کا حل دولت کے حصول ہی کو سمجھنے لگا ہے، لیکن حصول دولت کی جدوجہد سے اس کے مسائل میں کمی کی بجائے زیادتی ہونے لگتی ہے، وہ احساس برتری کے ساتھ حرص وہوس کے نہ ختم ہونے والے احساسات میں مبتلا ہوگیا ہے، سکون سے محروم ہوگیا ہے، دولت کے جنوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اسے ایک سزا یہ ملتی ہے کہ

لذیذ چیزوں کے استعمال سے اس کی جسمانی بیماریوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے، چنانچہ دولت کے حریص اکثر افراد کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ابلا ہوا کھانا کھانے پر مجبور ہیں، ورنہ ان کی زندگی خطرہ سے دوچار ہوجاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے سارے مسائل کے حل کی چابی اس کے اندر میں اس کی فطرت سلیمہ میں موجود ہے، فطرت سلیمہ کی بیداری کے ذریعہ روحانی قوت کو مستحکم کرکے، اللہ سے اپنے تعلق کے ذریعہ وہ اپنے سارے مسائل کو حل کرواسکتا ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُواْ وَاتَّقَواْ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ. (اور اگر یہ قصبہ والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے لئے آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے)۔

اس خوش خبری کے باوجود اپنی محسن خالق ہستی کی طرف رجوع نہ ہونا، اس سے محبت کرنے کے بجائے مادی دنیا سے محبت کرنا، یہ انسان بلکہ انسانیت کا سب سے بڑا المیہ ہے اور اس کے سارے مسائل کی بنیاد ہی یہی ہے۔

مسائل دو طرح کے ہیں،ایک خارجی زندگی کو لاحق مسائل ہیں، جن میں غربت، امن وامان اور مادی سہولتوں کے فقدان وغیرہ جیسے مسائل شامل ہیں، دوسرے نوعیت کے مسائل کا تعلق باطنی وروحانی اضطراب، ذہنی دباؤ، دل کی تشنگی وپیاس، اداسی، بے یقینی، احساس تنہائی اور زندگی کے بے معنیٰ ہونے کے احساسات سے ہے۔

یہ دونوں طرح کے مسائل ایسے ہیں، جن کے حل کی ضمانت اللہ نے اپنی طرف رجوع ہونے،اپنے ساتھ تعلق کو مستحکم کرنے، مادہ کی پرستش سے بچ کر،محض اس کی عبادت واطاعت کرنے، اس سے لو لگانے، اس کے احکامات پر عمل پیرا ہونے اور اس سے والہانہ محبت کرنے اور اس سے مانگتے رہنے سے وابستہ کی ہے۔

بدقسمتی سے مادی زندگی کے حاوی ہونے اور اسے اپنے اوپر مسلط کرنے کے نتیجہ میں انسان کی فطرت سلیمہ مسخ ہوچکی ہے، اس کے مسخ ہونے سے وہ مسائل کے حل کے اس سب سے اہم نکتہ اور اہم حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

قلب کی ہمہ گیریت کو سمجھنے کی ضرورت

تعمیر سیرت کے کام کا سارا تعلق دل کو بدلنے کے کام سے ہے، اس لئے قرآن وسنت اور بزرگان دین کے علوم میں انسانی زندگی کو بدلنے کے سلسلہ میں دل کی صلاحیتوں کو فیصلہ کن اہمیت دی گئی ہے اور دل جب قلب سلیمہ کا حامل ہوتا ہے تو انسانی زندگی پاکیزگی کا نمونہ بن جاتی ہے اور دل جب محبوب حقیقی سے محبت کے مراحل طے کرتا ہے تو وہ آداب انسانیت اور سلیقہ انسانیت سے آشنا ہوجاتا ہے اور اس طرح کے افراد اپنی ذات اور معاشرہ کے لئے باعث خیر بن جاتے ہیں، لیکن مغربی علوم وفنون کے زیر اثر جب سے ہم نے اپنے تعلیمی وتربیتی نظام میں دل کی بیداری کے کام کو غیر اہم سمجھ کر اسے فراموش کر دیا ہے، اس وقت سے ہمارے یہاں نفس پرست مادہ پرست اہل سیاست،اہل تجارت اور سرکاری آفیسروں کے غول کے غول پیدا ہورہے ہیں، جو دنیا کی چند دنوں کی زندگی کی راحت وآسائش کے جذبات سے سرشار ہوکر، قوم وملت کو ہر اعتبار سے لوٹ رہے ہیں اور دشمن کے آلہ کار ہونے کا کردار ادا کررہے ہیں، یہ سب نتیجہ ہے اس بات کا کہ ہمارے دل اندھے ہوچکے ہیں، دل کی صلاحیتیں مفلوج ہوچکی ہیں، جب تک ہم اپنے علوم کے مطابق دل کی تربیت اور اس کی صلاحیتوں کی بیداری اور محبوب حقیقی سے اس کی محبت کے جذبات کے ارتقا کے کام کو اہمیت نہ دیں گے، ہماری حیثیت حضرت موسیٰ کی قوم بنی اسرائیل کی طرح رہے گی،جو چالیس سال تک پہاڑ کی گھاٹیوں میں دربدر پھرتے رہے، ان کے لیے چالیس سال تک صحیح راستہ کے دروازے بند ہوگئے۔

دل کی غیر معمولی صلاحیتوں کے بارے میں جدید سائنسی تحقیق ایسی ہے، جو بزرگان دین کی تعلیمات کی تصدیق کرتی ہے، اس سلسلہ میں ہم یہاں دل کے ایک ممتاز ماہر کی تحقیقات کا حاصل پیش کررہے ہیں، جو ایک رسالہ میں شایع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر غیور ایوب صاحب برسوں کے اپنے تجربات کا حاصل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں: صوفیائے کرام جسے قلب کہتے ہیں، وہ محض گوشت کا وہ ٹکڑا نہیں، جو سینے میں رکھا ہوا ہے اور نہ ہی یہ محض خون کو رواں رکھنے کا آلہ ہے، بلکہ یہ ایک منفرد ہیت کا ٹکڑا ہے، اس کی حقیقت کا پہلا انکشاف اس طرح ہوا کہ دل کی پیوندکاری کے بعد مریض میں عطیہ کرنے والے کی شخصیت کے مطابق تبدیلیاں ہونے لگیں، تحقیق کرنے سے دل اور دماغ کے کچھ حصوں میں قریبی رابطے کا بھی پتہ چلا، جو شعور، ذہانت اور عقل کی تشکیل کرتا ہے، ۱۹۶۰ء میں جب میں دماغ کے مختلف حصے کاٹ کاٹ کر نو عمر طالب علموں کو اٹالومی (یعنی جسمانی ساخت) کی تعلیم دیتا تھا، اس وقت بھی شعوری اور غیر شعوری حلقوں کے نظاموں کو تلاش کرنا اور ان کا آپسی تعلق معلوم کرنا، میرے لئے کٹھن مگر مسحور کن تھا، بطور خاص دانائی سے منسلک سامنے کے لوتھڑے کا اگلا حصہ، بینائی سے متعلق عدسی (آپٹیکل) لوتھڑے کا ظاہری حصہ گویائی کے متعلق ماتھے کے بائیں طرح کی جڑ والا حصہ اور ماتھے کی دائیں طرف والا لوتھڑا جو غیر سمعی اطلاعات سے متعلق تھا، میرا جوش و جذبہ بڑھادیتے اور میرے اندر ہیجان برپا کردیتے، میرا یہ تعجب اور ہیجان اور بڑھ گیا جب میں نے کھوپڑی کے جڑ والے حصے کو کاٹ کر دیکھا بالخصوص (Hypotholamus & Amyglobia) جو بادامی شکل ہے اور غیر اختیاری امور کو کنٹرول کرتا ہے۔

سہولیات کی عدم دستیابی کے سبب میں اس وقت ان عصبی راستوں کی کانٹ چھانٹ تو نہ کرسکا، مگر مجھے یقین تھا کہ یہ ایک دوسرے سے بالواسطہ اور بلا واسطہ منسلک ضرور ہیں، پھر ایک روز جب میں سڑک عبور کررہا تھا تو یہ بات مجھ پر عیاں

ہوگئی، کیونکہ دائیں، بائیں دیکھکر ابھی میں نے چند قدم ہی بڑھائے تھے کہ ہارن کی آواز سے چونک کر میں یکدم پلٹا اور ایک تیز رفتار کار میرے نزدیک سے گزر گئی، دھڑکتے دل اور پسینے میں شرابور جسم کے ساتھ میں نے سڑک تو عبور کرلی، لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ وہ کونسی چیز تھی، جس نے میرے شعوری اور غیر شعوری خیالات اور سوچ کو منسلک کرکے، میرے جسم کو اس مربوط ردعمل پر مائل کیا، بحیثیت ڈاکٹر مجھے معلوم تھا کہ میرے دل اور دماغ کا یہ واسطہ بذریعہ رطوبت ہے، جولڑو، بھاگو، خوف اور جوابی عمل تھا، لیکن انتہائی تیز مربوط اور ناقابل وضاحت ردعمل نے مجھے ان روابط کے علاوہ دیگر اسباب پر غور وفکر پر مجبور کردیا، کئی عشروں بعد محققین نے نہ صرف ان واسطوں پر روشنی ڈالی، بلکہ یہ بھی بتایا کہ دل بھی شعور رکھتا ہے اور شعوری قوت کا حامل ہے، ان کی تحقیق کے مطابق ۲۰۰ سال پہلے تک دماغ اور شعور علیحدہ علیحدہ وجود تصور کئے جاتے تھے، پھر نیوٹن کی مادی طبیعات نے دماغ کو ذہن کا عامل حصہ بنادیا اور دل محض خون کو پمپ کرنے والا جز بن گیا، جسے بالواسطہ یا بلا واسطہ دماغ قابو کرتا، بیسویں صدی میں عددی طبیعات نے نیوٹن کے قوانین کے بارے میں شبہات کو جنم دیا، جو شعور یا ذہن کو دماغ سے علیحدہ کردانتے، گویا یہ سوچ صوفیاء کے قلب کے بارے میں اس انداز فکر سے مطابقت رکھتی ہے، جس میں وہ صدیوں سے شعور کو قلب سے جوڑتے رہے ہیں۔

جلد ہی مجھ پر سائنسی نکتہ آشکار ہوا کہ صوفی کا تصور قلب ان پیچیدہ بلا واسطہ اور بالواسطہ عصبی اور کیمیائی راستوں کے متعلق ہے، جو شعوری دماغ کے چار اہم حصوں اور تحت الشعور کے چار اہم حصوں کے بارے میں ہے اور یہی نقطہ تھا، جو لیکچرشپ کے ابتدائی دنوں میں مجھے کھٹکتا تھا، یہ حلقے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور دل سے بھی، جدید تحقیقات ظاہر کرتی ہیں کہ دل کا اپنا عامل ذہن اور شعور ہے، جو دماغ سے منسلک ہے، اور دونوں ایک دوسرے کو ایک پیچیدہ عمل سے متاثر

کرتے رہتے ہیں، اس سے میرے اس عقیدے کو تقویت ملی کہ قلب دراصل آزاد شعور، ذہانت یا ذہن ہے، جو دل ودماغ میں رکھے بنیادی مرکزوں (جو آپس میں بالواسطہ اور بلا واسطہ اعصابی نظام اور کیمیائی روابط رکھتے ہیں) سے تشکیل پاتا ہے۔

دماغ کے مرکزوں کا ذکر اوپر ہوچکا، دل کے اہم مراکز دوطرح کے خلیوں یعنی سکڑنے والے اور ترسیل کرنے والے خلیئے، اول الذکر خلیئے دل کی دیواروں کا بڑا حصہ بناتے ہیں، جبکہ ترسیلی خلیئے دل کی حسیات مثلاً سرسراہٹ، پھیلاؤ وغیرہ کے ریشوں کی مدد سے سکڑنے کے عمل کو خودکار بناتے ہیں، جس کے لئے یہ ریشے مختلف حسیات پیدا کرتے اور ترسیل کرتے ہیں، امراضِ قلب کے بارے میں ایک جدید نظم جسے اعصابی کارڈیالوجی کہتے ہیں نے بتایا ہے کہ دل معلومات کے حصول اور تجزیہ کے لئے ایک نہایت لطیف مرکز ہے، اس کا اعصابی نظام اندازاً چالیس ہزار ذاتی عضلات پر مشتمل ہے، جو دل اور دماغ کے درمیان معلومات کے تبادلہ کو استوار رکھتا ہے، معلومات کا یہ تبادلہ اعصابی راستوں اور کیمیائی تعامل سے وجود میں آتا ہے، اضافی طور پر دل بذریعہ برقی مقناطیست سے بھی رابط کرتا ہے، اور مقناطیسی کشش کا دل کا یہ دائرہ دماغ سے ۶۰ گنا زیادہ اور ۵۰۰۰ گنا زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور اسے چند فٹ کے فاصلہ پر مقناطیسی آلوں سے ماپا بھی جا سکتا ہے، محققین کا کہنا ہے کہ ان روابط سے دل آزادانہ طور پر سیکھنے، یاد رکھنے، عملی فیصلے کرنے اور بالائی دماغ کو سگنل ارسال کرنے کے قابل ہوتا ہے، خصوصاً ادراک، پہچان اور جذباتیت سے متعلق معاملات جن میں دماغ، دل کے ان پیغامات سے متاثر ہوکر عملی فیصلے کرتا ہے، بعض محقق اس سے بھی ایک قدم آگے کہتے ہیں کہ کسی شخص کی جذباتی کیفیت بھی دل کے برقی مقناطیسی دائرے سے ہی منتقل ہوتی ہے، چنانچہ مختلف جذباتی کیفیات میں دل دھڑکن کے زیرو بم میں نمایاں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، ان کے مطابق دل کی دھڑکن میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں دل کے مقناطیسی دائرے میں

ہونے والی تبدیلیوں کے مطابق ہوتی ہیں، اور انہیں خیالات واحساسات کے تجزیہ سے ناپنا ممکن ہے۔

قلب کے یہ مادی طبعی روابط جسم پر عضویاتی اور نفسیاتی اثرات مرتب کرتے ہیں، مثلاً عضویات کی سطح پر یہ جسم کی استعداد کار، باہم آہنگی اور باہمی روابط کو بڑھاتے، جبکہ نفسیاتی سطح پر اس سے دباؤ میں کمی، جذباتی توازن میں اضافہ، ذہنی بالیدگی میں وضاحت، وجدانی ذکاوت اور فہیم اظہار میں اضافہ ہوتا ہے، یہ طبعی نفسیاتی اتصال کہلاتا ہے، جو شعور کو بڑھاوا دیتا ہے، تجربات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ طبعی نفسیاتی اتصال یا ربط اپنے اردگرد لوگوں کے بارے میں ہماری آگاہی وحساسیت میں اضافہ کا باعث ہے، یہ تمام سائنسی مشاہدات قلب کے بارے میں صوفیا کے اس تصور کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ یہ دماغ سے آزادانہ شعور اور ذہانت ومعاملہ فہمی رکھتا ہے، اس قلب کا اپنا ایک مادی پہلو ہے، جس کا ایک عضلاتی حصہ جسم میں دل ہے جو روحانی ارتقا اور شخصیت پر مادی نفسیاتی اثر رکھتا ہے۔ (روزنامہ بزنس ریکارڈ۔ ۱۰ ستمبر ۲۰۱۴ء)

علم ومعرفت کے حصول کے لئے کلی وقت کی ضرورت

امام ابو یوسفؒ نے ایک اہم نکتہ بیان فرمایا ہے کہ علم ایک ایسی چیز ہے کہ جب تک فرد خود کو اس کے لئے مکمل طور پر وقف نہ کرے گا، یہ علم اپنا تھوڑا سا حصہ بھی آپ کو نہیں دے گا، یہ نکتہ دراصل اس علم کے بارے میں ہے جو تقویٰ، معرفت، حکمت، فراست، باطنی بصیرت اور اجتہادی صلاحیتوں میں مہارت سے متعلق ہے، اس علم سے مراد ظاہری علم، فنوں کا علم، زبان دانی کا علم وغیرہ ہرگز نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہی علوم ہیں، جن کا اوپر ذکر ہوا، جب تک فرد تقویٰ، حکمت، فراست، معرفت، بصیرت اور قرآن وسنت میں موجود نور اور اس کے حقیقی فہم تک رسائی کے لئے طویل عرصہ تک اپنا کلی وقت صرف نہ کرے گا، اسے ان علوم کے قابل ذکر

اجزاء حاصل نہیں ہوسکیں گے، بلکہ ان علوم کا اسے کچھ حصہ بھی حاصل نہ ہوسکے گا، ایک جدید ماہر نفسیات کی ایک کتاب دیکھی تھی، اس میں واقعات کے حوالے سے یہ نکتہ لکھا تھا کہ ہر مادی فن کے حصول کے لئے دس ہزار گھنٹے کی محنت مطلوب ہوتی ہے، دس ہزار گھنٹوں کی مشقوں سے ہی فرد اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اس فن میں مہارت حاصل کر سکے اور اس فن کو چمکا سکے، اس کے بعد انہوں نے مختلف فنون کی حامل بڑی اور مشہور شخصیات کا ذکر کیا تھا کہ ان کو اپنے اپنے فن میں مہارت کا جو مقام حاصل ہوا، وہ اس فن میں برسوں تک فنا ہوجانے کے نتیجہ میں ہی ملا ہے، جب دنیاوی فنون میں ماہرانہ صلاحیت کے حصول کے لئے دس ہزار گھنٹے کی قربانی کی ضرورت درپیش ہوتی ہے تو ایسا علم ومعرفت جس سے دین ودنیا کی جملہ سعادتیں وابستہ ہوں، اس کے لئے تو مکمل فنائیت کے بغیر چارہ کار نہیں۔

اخلاص وبےنفسی کا، متوجہ الی اللہ ہونے سے پیدا ہونا

یہ نکتہ بہت اہم ہے، جسے مسلسل سمجھتے رہنے کی ضرورت ہے کہ اعمال میں جان، کاموں میں روح اور دعوتی جدوجہد میں خیروبرکت اور مقبولیت عنداللہ اخلاص، للھیت وبےنفسی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، جتنا زیادہ اخلاص ہوگا، اسی قدر فرد کی زندگی اور سیرت وکردار میں دوسروں کے لئے تاثیر پیدا ہوگی، اس لئے کہ اخلاص، ذہنوں کی سرحدوں کو عبور کرکے دلوں میں اپنی جگہ بنالیتا ہے، اس لئے مخلص آدمی کی مثال اس مینار کی طرح ہوتی ہے، جس سے روشنی پھیلتی ہے، لیکن اخلاص، للھیت وبےنفسی ایسی چیز ہے، جو تعلق مع اللہ اور متوجہ الی اللہ ہوتے رہنے سے ہی پیدا ہوتی ہے، بدقسمتی سے اس دور میں یہ سب سے اہم نکتہ نظر انداز ہوا ہے، جس کی وجہ سے اعمال اور دعوتی کاموں سے وہ روح مفقود ہوگئی ہے، جو مقبولیت عند اللہ کے ساتھ ساتھ معاشروں کی تبدیلی کا موجب بنتی ہے، اللہ سے مستحکم تعلق ہی سیرت وکردار کے استحکام کا باعث بنتا ہے اور اسی سے فرد وافراد معاشرے کے لئے خیر وبرکت کا

سبب بنتے ہیں، جب اعمال میں روح اور سیرت وکردار میں پاکیزگی پیدا ہونے والی چیز ہی رخصت ہوجائے تو بے جان باتوں اور روح سے خالی اعمال کے اثرات فضا میں تحلیل ہوکر رہ جاتے ہیں۔

محاسبۂ نفس کے عمل کا مسلسل جاری رہنا ناگزیر ہے

نفس، قابل اعتبار ہرگز نہیں، اس لئے اس کے محاسبہ سے غافل نہ ہونا چاہیے، اسے جوں ہی سازگار حالات میسر ہوتے ہیں یا ذکر سے اس کی غفلت بڑھ جاتی ہے تو وہ پوری شدت سے حملہ آور ہوکر اور نہیں تو طالب کو فکری انتشار اور وسوسوں کا ضرور نشانہ بناتا ہے، اگر اسے امراء واغنیاء کی صحبت میسر ہو تو اس کا دل دنیا کے حوالے سے مچلنے لگتا ہے یا کم از کم مادی مفادات کے اس جذبات کروٹ لینے لگتے ہیں۔

نفس کی اسی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے ایک بار مجلس میں جس میں اکثر منتہی طالب شریک تھے، فرمایا تھا کہ نفس کی طرف سے غافل نہ ہونا، اپنا محاسبہ کرتے رہنا، پھر آپ نے کاغذ کے پلندہ جو ایک جگہ رکھا ہوا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ نفس جب بھی مجھے وسوسوں اور حدود سے تجاوز کی باتیں سجھاتا ہے، اس وقت میں نفس کی اس حالت کو تحریری صورت دیتا ہوں، اور نفس کو انتباہ کرتا رہتا ہوں، یہ سارا پلندہ نفس کے انہی حالات کے موضوع سے بحث کرتا ہے، اندازہ لگائیں کہ جب حکیم الامت جیسی شخصیت نفس کی معمولی اکساہٹ کی چیزوں کے سلسلہ میں اتنی حساس ہے تو ہمارا نفس تو معلوم نہیں کتنا طاقتور ہے، وہ دن میں کتنی بار ہمیں اپنے در پر سجدہ ریزی پر مجبور کرتا ہے، ہمیں اس سلسلہ میں محاسبۂ نفس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، ورنہ اس صورتحال سے بچنا ممکن نہیں، جو اس وقت پیدا ہوگئی ہے کہ تصوف عام طور پر کاروبار وتجارت کی صورت اختیار کرچکا ہے، اس دکاندارانہ تصوف میں مزید اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

شخصیت کی تعمیر میں اہل تصوف کا کردار

کچھ اہم مباحث

اہل تصوف نے ہر دور میں معاشرہ کو دینی، اخلاقی اور روحانی طور پر سنبھالا ہے، اور اس کے زوال کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس دور میں بھی اہل تصوف خاموشی سے یہ کردار ادا کرنے کے لئے کوشاں ہیں، لیکن مادیت کی ہمہ گیر طوفان کی وجہ سے جہاں دوسرے طبقات متاثر ہوئے ہیں، وہاں ادارہ تصوف پر بھی اس کے اثرات پڑے ہیں، پھر تصوف کی وہ ریاضتیں جو پہلے اہل تصوف کا حصہ رہی ہے، وہ اس دور میں مفقود ہوئی ہیں، اس کی وجہ سے دنیا داری، جذبۂ شہرت وخودنمائی اور خلافت وبزرگی کے ذریعہ مال کمانے کی روش عام ہوئی ہے، اس وقت ملک کے مشہور بزرگوں میں اس کی نمود نظر آتی ہے، اہل تصوف کی سب سے بڑی اور امتیازی خصوصیت دنیا سے استغنا و بے نیازی، زہد وفقر رہی ہے، ان کی زندگی کے اس رنگ کو دیکھکر، معاشرے میں مادی راحتوں کے سامان پر ٹوٹ پڑنے کی اداؤں میں کمی پیدا ہوتی رہی ہے۔ اس طرح مسلم معاشرہ ہر دور میں مادیت کی طوفانی لہروں کا بُری طرح شکار ہونے سے بچتا رہا ہے۔

ملت کی تاریخ میں یہ پہلا دور ہے کہ اب معاشرہ تیزی سے دنیاداری کی روش پر گامزن ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس صورتحال پر تفصیل سے بحث کرکے، اصل تصوف اور تصوف کی حقیقت واصلیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تصوف میں یہ نقائص کیوں پیدا ہوئے

کہ وہ دکاندارانہ صورت اختیار کر چکا ہے۔

ساتھ ساتھ مضمون میں تصوف کے حقیقی خدوخال پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ اس گئے گزرے دور میں اصلاح کے حقیقی طالبوں کے لئے حقیقی اہل اللہ دستیاب ہیں، طلب وتلاش کے بعد ایسے اہل اللہ تک رسائی ہوسکتی ہے، اس طرح کے اہل اللہ سے صحبت ورابطہ اور ان کے دیئے ہوئے ذکر پر محنت کے نتیجہ میں بہتر انسان، پاکیزہ انسان اور نفس مطمئنہ کے حامل افراد تیار ہو سکتے ہیں، بلکہ تیار ہورہے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ مضمون ہفتہ وار اصلاحی نشست کے لئے لکھا گیا تھا اور اس کی مختلف نشستوں میں پڑھا گیا۔

محمد موسیٰ بھٹو

دور جدید میں تصوف کے بعض اہم اصولوں کی نشاندہی

(سالکوں کے لئے)

تصوف میں دوچیزیں فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہیں، ایک صحبت اہل اللہ دوسرے ذکر وفکر کے مجاہدے، ان دوچیزوں کے نتیجہ میں جو سعادتیں حاصل ہوتی ہیں، ان میں اسلامی شریعت پر عمل کرنے میں آسانی کا پیدا ہونا، باطنی اور روحانی بیماریوں کی بتدریج اصلاح کا ہونا، سیرت وکردار میں پاکیزگی کا ہونا، اللہ سے محبت کے ارتقائی مراحل کا طے ہونا، آخرت کی فکر کا غالب ہونا، حب جاہ وحب مال اور حرص وہوس جیسے جذبات سے بچاؤ کی صورت کا پیدا ہونا وغیرہ شامل ہے۔

تصوف کے بعض اصول بھی ہیں، جن کی پابندی کے بغیر فرد وافراد کی اصلاح کی راہ میں سخت رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، پہلا اصول کم سے کم بولنا، اس لئے کہ گفتگو سے روحانی اور ایمانی قوت خرچ ہوتی ہے۔ جب روحانی قوتیں بیدار سے بیدار تر

ہوتی جائیں گی تو اس کے بعد گفتگو میں زیادہ حرج نہیں، اس لئے کہ روحانی طاقت کی موجودگی میں گفتگو میں احتیاط کی ازخود صورت پیدا ہوتی جائے گی۔

تصوف کا دوسرا اصول کم ملنا ہے، اس لئے کہ زیادہ رابطہ سے دوسروں کے منفی اثرات منتقل ہو کر، طالب کے روحانی سفر میں خلل ڈالنے کا موجب بنتے ہیں اور نفس پرست افراد کے دلوں میں موجود منفی شعائیں منتقل ہو کر، طالب کے دل کو زیر وزبر کر دیتی ہے، البتہ کثرت ذکر کے نور کے حصول کے بعد زیادہ میل جول میں کوئی حرج نہیں۔

تیسرا اصول تصوف اور اللہ کی محبت سے طبعی مناسبت نہ رکھنے والے افراد سے دوستانہ تعلقات سے پرہیز کرنا ہے، اس لئے کہ ایسے افراد کی صحبت اور گفتگو سے اہل تصوف سے دوری کی فضا پیدا ہوتی ہے اور فرد کے لئے اہل اللہ سے بدظنی سے بچنا دشوار ہوتا ہے۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ اگر کاروباری اور ملازمت کی مجبوریوں کی وجہ سے نفس پرست افراد سے رابطہ رکھنا اور ان کے ساتھ وقت گذارنا مجبوری ہے تو ان کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے روحانی استاد سے اپنے رابطہ کو مستحکم کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ یہ رابطہ ہی ان کے منفی اثرات کے ازالہ کا باعث بنے گا اور یہ رابطہ ان کے ذکر وفکر کے دورانیہ میں اضافہ کا ذریعہ بنے گا۔

پانچواں اصول یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا جو زیادہ تر مادی حسن اور لغو مناظر سے بھرپور ہوتا ہے، اس کے استعمال میں زیادہ سے زیادہ احتیاط ہو، دوسری صورت میں طالب کے جنسی جذبات اور فکری انتشار میں اضافہ ہوگا، جس کی وجہ سے اس کی روحانیت کا سفر بُری طرح متاثر ہوگا۔

چھٹا اصول یہ ہے کہ طالب، راہ سلوک میں زیادہ تیز رفتاری سے چلنے والے اپنے ساتھیوں سے رابطہ رکھ سکتا ہے، اس سے اسے روحانی مسرت حاصل ہوگی۔

تاہم اپنے اس طرح کے ساتھیوں سے کاروباری معاملات نہ ہوں تو بہتر ہے، اس لئے کہ ان سے کاروباری معاملات سے شکوہ شکایات پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔

ساتواں اصول یہ ہے کہ طالب، راہ سلوک کے سفر کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دے، اس مقصد کے لئے اسے کاروبار میں بہت زیادہ وقت دینے سے بچنا چاہئے، اگر طالب سرکاری افسر ہے تو اسے گوشہ میں جانا چاہئے، یعنی نفس پرست اور مادہ پرست سرکاری افسروں کے گھیرے سے بچ کر، اپنے لئے ایسا شعبہ تلاش کرے، جہاں کھانے پینے کے مواقع نہ ہوں اور جہاں اسے ذکر وفکر کے لئے بھی وقت مل سکے۔

تصوف کے اصولوں میں ایک بات یہ بھی شامل ہے کہ بیک وقت دو بزرگوں سے اصلاحی تعلق قائم رکھنا سخت نقصاندہ ہے، اس لئے کہ اس سے کسی بھی ایک بزرگ سے روحانی استفادہ کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، فرد دو معالجوں کے درمیاں شدید کشمکش کا شکار رہتا ہے، اور کسی ایک سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، بلکہ کچھ مہینوں کے بعد وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہوجاتا ہے۔

کسی روحانی استاد کو بغیر کسی معقول عذر کے چھوڑنے کا جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ طالب زندگی بھر شیخ بدلتا رہتا ہے، اس کی اصلاح کی صورت کم ہی پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ جس شیخ سے اسے فیض حاصل ہورہا تھا، اس شیخ کو اس نے محض اپنے ادلتے بدلتے ہوئے مزاج کی وجہ سے چھوڑا، اس طرح وہ اس کی اذیت کا موجب بنا، اس کے مزاج کا یہ تغیر اسے کسی سے بھی جم کر فیض حاصل کرنے کے قابل نہیں چھوڑتا، یہ اہم نکتہ ہے جو متعدد روحانی طلبہ کے تجربات سے مشاہد ہوا ہے۔

تصوف کا ایک اصول یہ ہے کہ روحانی استاد سے غیرضروری گفتگو یا اصلاح نفس کے باہر کے مسائل پر زیادہ تبادلہ خیال صحیح نہیں، اس سے ایک تو روحانی استاد

سے محبت میں کمی واقع ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اور محبت میں کمی کی وجہ سے روحانی فیض رسانی اور اصلاح نفس کا سلسلہ متاثر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ غیر ضروری گفتگو سے طالب کے ساتھ روحانی استاد کے دل پر بھی کدورت کے اثرات طاری ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جو چپ رہا (خاموش رہا) اس نے نجات حاصل کرلی۔

موجودہ دور میں چونکہ نوجوان نسل میڈیا کے زیر اثر اشکالات کا شکار رہتی ہے، اس لئے اس دور میں اس سلسلہ میں اس اصول میں کچھ تخفیف کی جا سکتی ہے، اس لئے کہ اشکالات کے حل کے بغیر طالب کا ذہنی یکسوئی سے راہ سلوک میں چلنا دشوار ہے۔

لیکن طالب نے اگر ایک بار ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صحبت وذکر ومراقبہ کا عمل شروع کر دیا تو اس سے اسے جو حلاوت حاصل ہوگی وہ حلاوت اسے از خود زیادہ گفتگو سے دور کردے گی۔

ایک اصول یہ بھی ہے کہ روحانی استاد کے دعوتی کاموں میں تو مالی تعاون ضرور کیا جائے، لیکن اس سے ذاتی طور پر بھرپور مالی تعاون کرکے، اسے مالداری کی راہ پر گامزن ہونے نہ دیا جائے۔ ایک سابقہ مذہب کی بنیادی کتاب میں ہے کہ اپنا مال درویش کو بھی نہ دکھایا جائے، اس لئے کہ مال دیکھکر اس کا منہ پانی پانی ہوجاتا ہے اور اس کی مال کی آرزو کروٹ لینے لگتی ہے۔ موجودہ دور میں مال نے متعدد بزرگوں کی بزرگی کو خطرہ میں ڈال دیا ہے، اگرچہ حقیقی مجاہدوں اور اپنے شیخ کی طویل عرصہ کی صحبت کے نتیجہ میں مال کی محبت بڑی حد تک زائل ہوجاتی ہے، لیکن اس دور میں طویل عرصہ کی صحبت اور غیر معمولی مجاہدوں کی سعادت ہم جیسے خام صوفیاء کو کہاں حاصل ہے؟

یہ سارے اصول ایسے ہیں، جو اہم ہیں، ان کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں

طالب کا روحانی سفر، سلوک کا سفر بُری طرح متاثر ہوسکتا ہے۔

ان چیزوں کے ساتھ ساتھ طالب کو غریبوں کی مدد، دین کے دعوتی کاموں میں تعاون اور دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے لئے دعا کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے، ان چیزوں سے بھی اس کی روحانی ترقی میں اضافہ ہوگا۔

دور جدید میں مادیت کی عالمگیر طوفانی لہروں سے جب کہ فرد کا دین وایمان، اخلاق، کردار اور انسانیت ہر چیز خطرہ میں ہے، ان حالات میں طالب کے کرنے کا ایک اہم کام یہ ہے کہ وہ ذکر وفکر (مراقبہ) کو آدھے گھنٹے سے شروع کرکے ڈیڑھ سے دو گھنٹے تک پہنچانے کی کوشش کرے، اس سے ان شاء اللہ اس کے لئے مادیت کی ساری طوفانی لہروں سے بچاؤ اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی صورت پیدا ہوتی جائے گی۔

اگرچہ بعض خوش نصیب طالب ایسے بھی موجود ہیں، جو روزانہ پانچ سات گھنٹے تک مراقبہ کرتے ہیں، جس سے وہ ہر طرح کی حلاوتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ ایسے افراد کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ، **ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ** (یہ اللہ کا فضل ہے جس پر وہ چاہتا ہے کرتا ہے)۔

روحانی استاد اور طالب کے بعض اہم معاملات

تصوف میں باطنی بصیرت پیدا ہوتی اور ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ صوفی، معاملات ومسائل اور افراد کی نفسیات کے بارے میں باطنی بصیرت کی روشنی میں دیکھتا ہے اور معاملات کے مثبت ومنفی پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے۔ صوفی کے مجاہدے جتنے زیادہ ہوتے ہیں، اس کی باطنی بصیرت اسی مناسبت سے بہتر اور صحیح ہوتی ہے۔ مجاہدوں میں کمی سے باطنی بصیرت اسی حساب سے کم ہی اجاگر ہوتی ہے۔

روحانی استاد، طالب کی تربیت کے لئے جو باتیں بیان کرتا ہے، طالب کو ان باتوں کو عام افراد کی سی باتیں سمجھکر نظر انداز نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ تربیت کے

حوالے سے ہونے والی صوفی کی باتوں میں برسوں کے شب وروز کے مجاہدے اور خون جگر شامل ہوتا ہے، طالب اگر صوفی کی ہدایات اور تعلیم کو غیر اہم سمجھے گا تو وہ محسوس کرے گا کہ اس کی اسے نقد سزا مل رہی ہے۔

مثلا روحانی استاد اگر ایک طالب کے خصوصی حالات کے پیش نظر اس کے لئے ایک خاص تعداد میں ذکر متعین کرتا ہے تو اسے اتنی مقدار میں ہی ذکر کرنا پڑے گا، اگر وہ اس سے کم مقدار میں ذکر کرے گا تو اس کا فائدہ بہت زیادہ متاثر ہوگا، یا مثلا اگر صوفی طالب کو غیر ضروری گفتگو یا تصوف واہل تصوف کے مخالف افراد سے رابطہ وتعلقات سے روکتا ہے تو اسے ایسا کرنا چاہئے، ورنہ تصوف میں چلنا اس کے لئے دشوار ہوجائے گا۔

تصوف میں خودرائی کے نتائج طالب کے لئے غیر معمولی طور پر نقصاندہ ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا طالب سلف صالحین اور بزرگان دین کے فیوض وبرکات ہی سے محروم ہوجاتا ہے۔

تصوف نہایت نازک معاملہ ہے، اس کے اصولوں کو سمجھنا ازحد ضروری ہے۔ اگرچہ روحانی استاد کی صحبت ومحبت طالب کو ان اصولوں سے از خود آشنا کردیتی ہے، لیکن بعض طالب ایسے ہوتے ہیں، جن کی طبیعت پیچیدگیوں کی حامل ہوتی ہے، وہ روحانی استاد سے محبت کے سلیقہ سے آشنا نہیں ہوتے، اس طرح کے طالب کے لئے تصوف کے اہم اصولوں کو سمجھنا ضروری ہے، تاکہ اس کے دل کے ساز بجتے رہیں اور دل کے نور میں اضافہ ہوتا رہے۔

تصوف سراپا محبت کا ذریعہ ہے، اللہ سے محبت، اللہ کے رسول سے محبت، روحانی استاد سے محبت، اللہ کے بندوں سے محبت، اگرچہ سب کی محبت کے اپنے اپنے حدود اور دائرے ہیں۔ پھر تصوف میں محبت کا یہ عمل ایک رفتار سے یعنی آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور اس کے ارتقائی مراحل طے ہونے میں وقت لگتا ہے۔ یعنی دل

کے سارے حصے محبت سے سرشار ہوجائیں، اس کے لئے راہ سلوک میں عرصہ تک چلنا پڑتا ہے، اس عمل میں جلدی چاہنا یا جلد بازی کا مظاہرہ ہونا نقصاندہ ہے، اس راہ میں صبر، ہمت، حوصلہ واستقامت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ تصوف کے ثمرات سے پوری طرح وہی طالب فیضیاب ہوتا ہے، جو استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے، یہ ثمرات بہتر انسان، پاکیزہ انسان اور اسلامی شریعت سے پوری طرح ہمہ آہنگی کی صورت میں ہی ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ واضح ہونا بھی ضروری ہے کہ راہ سلوک میں چلنے والا ہر طالب روحانی استاد کو نہ صرف عزیز تر ہوتا ہے، بلکہ وہ اس کے لئے سرمایہ ہوتا ہے، وہ اس کی معنوی اولاد ہوتا ہے، وہ اس کی روحانی وراثت کا حصہ دار ہوتا ہے، روحانی استاد کے دل میں اس کی قدر وقیمت اس لئے بھی زیادہ ہوتی ہے کہ ایک تو وہ ذکر وفکر کے ذریعہ نفسی قوتوں سے شدید کشمکش کی حالت میں رہتا ہے۔ گویا وہ ہمالیہ پہاڑ طے کررہا ہوتا ہے، دوم یہ کہ وہ مادی قوتوں سے صف آرائی میں رہتا ہے، اس کی دنیا، مادی نوعیت کے انسان سے مختلف ہوتی ہے، اس کی وجہ سے اسے جن غیر معمولی مشکلات سے گذرنا پڑتا ہے، وہ ہمت وحوصلہ سے ان کا مقابلہ کررہا ہوتا ہے، سوم یہ کہ محبوب کی طرف سے وقتا فوقتا اس کے نفس پر اپنی جلالی تجلیات کے تیر گراکر، اسے جس بے پناہ حالت قبض میں رکھا جاتا ہے، یہ اسی کا جگر ہے کہ وہ یہ سب کچھ برداشت کرتا ہے اور اف بھی نہیں کرتا۔

یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو روحانی استاد کی نظر میں اس راہ میں چلنے والے مستقل مزاج طالب کی قدر وقیمت کو بڑھا دیتا ہے، وہ ان کی استقامت اور ان کی کیفیات کی بہتری کے لئے دعا گو ہوتا ہے۔

حقیقی روحانی استاد اس انتظار میں ہوتا ہے کہ طالب اس سے رابطہ میں رہے، تاکہ رابطہ کے زیر اثر راہ سلوک میں درپیش اس کی مشکلات میں کمی واقع ہو اور اس کے لئے راہ سلوک میں تیز رفتاری سے چلنے کی صورت پیدا ہو۔

جو طالب صحبت ورابطہ میں سستی یا فرار اختیار کرتا ہے، اسے اس کی جو سزا بھگتنی پڑتی ہے، وہ یہ ہے کہ اول تو اس کے ذکر ومراقبہ میں ذوق وشوق ختم ہونے لگتا ہے، کیفیات پیدا ہونے نہیں پاتی، اگر صحبت ورابطہ میں وقفہ میں اضافہ ہوتا ہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کا ذکر ومراقبہ ختم ہوجاتا ہے، اس طرح وہ معاشرہ کا حصہ بن جاتا ہے۔ جو روحانی استاد کے لئے غیر معمولی اذیت کی بات ہوتی ہے۔

روحانی استاد کی طالب سے بظاہر محبت کی نوعیت ایسی ہوتی ہے، جو اس شدت سے ظاہر ہونے نہیں ہو پاتی، طالب یہ محسوس کرتا ہے کہ روحانی استاد سے بس وہی محبت کرتا ہے اور وہ اس کے لئے بے چین ہوتا ہے، جب کہ روحانی استاد کی حالت اس کے معاملہ میں سرد مہری کی سی ہوتی ہے۔

یہ دراصل طالب کی غلط فہمی ہوتی ہے۔ اگر دلوں کے حالات کو پرکھنے کا کوئی آلہ وجود میں آئے تو اس آلہ کی مدد سے معلوم ہوگا کہ طالب کی محبت کے مقابلہ میں روحانی استاد کی محبت اور اس کے لئے فکرمندی اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ جب حقیقی طالب، روحانی استاد کا معنوی سرمایہ ہے، جو زندگی بھر کی اس کی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس سرمایہ سے اس کی محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لیکن استاد جس مقام پر ہوتا ہے، وہاں طالب کی حکمت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ اپنی محبت کو پوری طرح ظاہر نہ ہونے دے۔

اہل اللہ کی صحبت کے کچھ ثمرات

حقیقی اہل اللہ کا سینہ اللہ کی محبت سے لبریز ہوتا ہے، اس میں دنیا موجود نہیں ہوتی، ان کا دل انسانیت کے لئے تڑپ رہا ہوتا ہے کہ انسانیت اپنے حقیقی محبوب سے ناشنائی کی وجہ سے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہے۔ وہ اس کی اس حالت زار پر غم زدہ ہوتا ہے کہ اس کی ساری کاوشوں کے باوجود وہ محبوب حقیقی کے انوار حسن سے بہرہ وری کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں۔

حقیقی اہل اللہ کا سینہ اللہ کی سوز محبت سے سرشار ہوتا ہے، وہ محبت کے اس

عمل کی منتقلی کے لئے بے چین ہوتا ہے، لیکن مادیت میں استغراق کی وجہ سے افرادِ معاشرہ ان سے دنیا کے سارے خزانوں سے زیادہ قیمتی خزانہ لینے کے لئے تیار نہیں، اس کا سبب دل کا اندھا پن اور روح کی مردگی ہے۔ اگر دل کی بینائی بحال ہوجائے اور حقیقی اہل اللہ کی صحبتِ مسلسل حاصل ہوجائے تو زندگی جملہ سعادتوں اور خیر وبرکت سے عبارت ہوجائے، اہل اللہ کی صحبت سے حاصل ہونے والی کچھ سعادتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

- ذکر وفکر اور عبادت کا ذوق وشوق پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے۔
- فرد نفسی، مادی اور شیطانی قوتوں سے معرکہ آرائی کی راہ پر گامزن ہونے لگتا ہے۔
- باطنی احساسات وجذبات کی پاکیزگی کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔
- پاکیزہ بنیادوں پر تعمیر سیرت کے عمل میں آسانی پیدا ہوجاتی ہے۔
- فرد پر ایک نئی معنوی اور حقیقی زندگی کے راز واسرار کھلنا شروع ہوجاتے ہیں، جسے وہ الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔
- شریعت پر عمل پیرا ہونے کا اس کا مزاج راسخ ہونے لگتا ہے۔
- انسانی جوہروں سے بہرہ وری نصیب ہونے لگتی ہے۔
- انسانیت کا درد پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے۔
- ہر طرح کے خوف وحزن سے بچاؤ کی صورت پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہے۔
- مزاج میں ٹھہراؤ واعتدال بلکہ پاکیزگی کی وجہ سے بہت ساری روحانی وجسمانی بیماریوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔
- فرد سکون وسکینت کے اس مقام پر آجاتا ہے، جہاں اسے دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔
- فرد حب جاہ وحب مال اور حرص وہوس وغیرہ کے جذبات سے محفوظ

ہونے کی وجہ سے افراد معاشرہ کو اپنی ذات سے نقصان پہنچانے سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

- وہ دل کا غنی ہونے لگتا ہے، یہ غنا اسے دنیا واہل دنیا سے بے نیاز کرنے کا باعث بنتی ہے۔
- محبوب سے محبت وعشق کی راہ ایسی قیمتی بن جاتی ہے کہ اس کے لئے وہ ہر طرح کی قربانی وایثار کے مظاہرے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔
- افراد میں محبت ورواداری کا مزاج پیدا ہونے لگتا ہے۔
- وہ نفس کی گہرائیوں میں ڈوب کر اندر سے قیمتی موتی وجواہر اپنے ساتھ لاتا ہے۔

راہ سلوک میں مسلسل مجاہدوں اور استقامت کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، جس طرح ہم کاروبار میں ترقی کے لئے جلد بازی اور بے صبری سے کام نہیں لیتے، بلکہ اسے مستحکم کرنے کے لئے ذہنی طور پر شب وروز اسی کے ہوجاتے ہیں، اس کے بعد کہیں جا کر کاروبار کے وہ نتائج نکلتے ہیں کہ فرد دولت سے کھیلنے لگتا ہے، اسی طرح یہاں بھی شب وروز چلنا پڑتا ہے، مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، مشکلات کا حوصلہ وہمت سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، ہر طرح کے حالات میں مسلسل نفس سے مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہوتا ہے۔

اس کے بعد کہیں جا کر فرد ان سارے انعامات کا مستحق ہوتا ہے، جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اللہ کی یہ سنت ہے کہ کوئی بھی نعمت آسانی سے نہیں ملتی۔ پھر آسانی سے ملنے والی نعمت کی قدر نہیں ہوتی، بے قدری کی وجہ سے وہ نعمت سلب کر لی جاتی ہے۔

صحبتِ مسلسل اور طویل مجاہدوں کے نتیجہ میں ملنے والی نعمت ایسی ہوتی ہے، جو فرد کو دائمی سعادت کا حامل بنا دیتی ہے۔ ایسے مجاہدے جو فرد کے لئے دائمی راحت کا ذریعہ بن سکیں، جس صحبت کے یہ اثرات وثمرات بیان کئے گئے، وہ صحبت کا مسلسل عمل ہے، جو حالت فنا سے حالت بقا تک رسائی تک جاری رہتا ہے اور صحبت کے

ساتھ ساتھ فرد کو ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ صحبت اور ذکر وفکر کے یہ مسلسل مجاہدے فرد کے نفس میں وہ خصوصیات پیدا کردیتے ہیں کہ وہ بظاہر اس دنیا میں موجود ہوتا ہے، لیکن وہ بباطن دوسری دنیا کا حصہ بن جاتا ہے۔

جس طرح مسلسل محنت اور ساری توانائیوں وصلاحیتوں کے استعمال سے فرد کا کاروبار جب چمک جاتا ہے تو اس کی طرف دولت اڈنے لگتی ہے، اور وہ مالدار سے مالدار تر بننے لگتا ہے، اسی طرح روحانی استاد کی سرپرستی میں فرد روحانی دنیا میں ترقی کرتے کرتے اس مقام پر آجاتا ہے، جہاں خیر وبرکت اور محبوب کے انوار اس کا گھیراؤ کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ انوار ہی کی دنیا میں رہنے لگتا ہے۔

ظاہر ہے یہ ثمرات دوچار سال میں حاصل نہیں ہوتے، اس کے لئے عرصہ تک صحبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ صحبتِ مسلسل اور مجاہدوں کے عمل سے گزرنے والے طالب کا ہدف ومقصود صرف ایک ہی ہوتا ہے، وہ ہدف محبوب حقیقی اور اس کی رضامندی ہوتی ہے۔

ایسے طالب کے دل سے دنیاوی شان ومان کی زندگی، جذبہ شہرت، مال بنانے کی خواہش اور زیادہ سے زیادہ مرید بنانے کی فکرمندی اور اس کے لئے تسخیری وظائف جیسی ساری چیزیں بے معنیٰ ہوجاتی ہیں۔ محبوب کی رضامندی بذریعہ اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے اور خدمت دین کے علاوہ دنیا میں اس کا کوئی ہدف نہیں ہوتا۔

اگر صحبت اہل اللہ اور مجاہدوں کے یہ نتائج حاصل نہ ہوسکیں، تو سمجھنا چاہئے کہ بھٹی کو مطلوبہ آگ فراہم نہ ہوسکی ہے، جس کی وجہ سے بھٹی سے خام اینٹیں نکلی ہیں اور خام اینٹیں ایسی چیز ہیں، جس کی بنیاد پر کوئی بڑی عمارت تو کیا چھوٹی سی عمارت بھی تعمیر نہیں ہوسکتی۔

موجودہ دور میں عمومی طور پر بزرگی کے نام پر جو افراد نظر آتے ہیں، ان کی حیثیت خام بھٹی کے تیار کردہ مال سے مختلف نہیں۔

ایسے اہل اللہ جن سے طالب فیضیاب ہوکر مذکورہ اوصاف وصفات کے حامل ہوسکیں، وہ اگرچہ اسی دنیا میں رہتے ہیں، لیکن موجودہ دور میں انہیں تلاش کرنا دشوار ہے، اس لئے کہ وہ نام ونمود اور شہرت کے سارے ذرائع سے بہت دور ہیں۔

اگر ایسا اہل اللہ دستیاب ہوجائے تو اس کے سامنے اپنے آپ کو پامال کرکے مجاہدوں کی راہ اختیار کرنا، اس طرح محبوب سے وصال کی منزل حاصل کرنا سب سے بڑی خوش نصیبی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ جیسے سیہ کار کی بھی اس طرح کے اہل اللہ تک رسائی کی صورت پیدا فرمائے۔

حقیقی اہل اللہ کے دل سے سچائیوں کا پھوٹ کر نکلنا اور ان کے فیوض سے محرومی کا المیہ

حقیقی اہل اللہ، نفس کے خلاف غیر معمولی مجاہدوں اور اللہ کے فضل خاص، نفسی حجابات اور نفسی کثافتوں سے بڑی حد تک محفوظ ہوجاتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کی فطرت سلیمہ سے ہمہ آہنگی ہوجاتی ہے اور قرآن وسنت کے اندر موجود نور تک ان کی رسائی ہوجاتی ہے۔ اس لئے نفسی قوتوں، مادیت، دنیا اور شیطان کے سلسلہ میں ان کی حس تیز سے تیز تر ہوجاتی ہے۔ ان کی باطنی بصیرت وباطنی بینائی اور باطنی آنکھیں روشن رہتی ہیں۔ بڑے گناہوں سے لے کر چھوٹے گناہوں تک ان کا احساس شدید تر ہوجاتا ہے۔

چنانچہ اس طرح کی صورتحال میں یعنی گناہ ہوجانے یا گناہوں کے خیالات ووسوسوں کی صورت میں وہ سخت چوکنا ہوجاتے ہیں۔ اسلامی شریعت ان کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ بظاہر سادہ، حقیر وفقیر نظر آتے ہیں، لیکن بباطن ان کا دل وروح محبوب سے متصل رہتا ہے۔ ایسے اہل اللہ جو فنا کی تکمیل کے بعد حالت بقا میں آتے ہیں، وہ ہمارے لئے اتنا بڑا سرمایہ ہیں کہ ساری دنیا ان کے مقابلہ میں ہیچ ہوتی ہے۔

اس طرح کے اہل اللہ کی صحبت سے ہی فرد وافراد کو نئی معنوی زندگی نصیب ہوتی ہے، جو آہستہ آہستہ ایمان کی گہرائیوں سے سرشار ہونے لگتی ہے۔ اور اللہ کی رضامندی کے احساسات اور عمل سے عبارت ہوجاتی ہے۔

ایسے اہل اللہ کے دلوں سے نکلنے والی شعائیں ہی ہیں، جو فرد وافراد کے لئے نفس اور مادیت کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے آمادگی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

ایسے اہل اللہ کے فیوض سے محرومی کا ایک سبب یہ ہے کہ ہم انہیں اپنی نفسی اور ذہنی سطح کے پس منظر میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہمارا علم، ہماری ذہانت اور ہماری دعویٰ ان کی اصلیت کے فہم کی راہ میں شدید رکاوٹ بن جاتی ہے، اس کا دوسرا سبب باطنی اصلاح کی طلب کا فقدان ہے کہ مینڈک تالاب کے زیرین حصہ میں موجود ہوتا ہے، اس کے ساتھ کنول کا پھول ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ پھول کی خوشبوء سے محروم ہوتا ہے اور مٹی پر گزارہ کررہا ہوتا ہے، اس لئے کہ مٹی پر گزارہ کرنا اس کی عادت بن جاتی ہے۔ کنول کے پھول کی خوشبو کو قبول کرنے کی اس میں صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ طلب نہ ہونے کی وجہ سے استعداد ختم ہوجاتی ہے۔

فاسد معاشرہ کی یہ ''خصوصیت'' ہوتی ہے کہ وہ جبلی اور مادی تقاضوں سے بلند ہونے کا روادار نہیں ہوتا، وہ مادیت سے چمٹا رہتا ہے، وہ روح اور دل کے تقاضوں اور اہل اللہ کے دلوں میں موجود طاقتور مثبت شعاؤں کے ادراک سے قاصر ہوتا ہے، فاسد معاشرہ کا یہی المیہ اسے مادیت کی دلدل میں مبتلا کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

اہل اللہ کی صحبت کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی زندگی ایسی ہے، جس کا تعلق قال سے نہیں، بلکہ حال سے ہے، اس کی نوعیت وحقیقت بیان کرنے کے لئے بڑے سے بڑے الفاظ بھی ناکافی ہیں۔ عقل وعقلیت کے ذریعہ اس کی حقیقت کو سمجھنا دشوار ہے، اس لئے کہ بہتر ایمانی کیفیات اور پاکیزہ محبت کے اسرار ورموز الفاظ کے سانچہ

میں ڈھل سکیں، محال تر بات ہے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ قیل وقال کے صاحبان اور ذہانت کے حامل افراد تصوف کی حقیقت کو عقلیت اور علمیت کے ذریعہ سمجھنا چاہتے ہیں، جب ایسا نہیں ہوتا تو وہ تصوف کے بارے میں اشکالات بلکہ اعتراضات کا شکار ہوجاتے ہیں۔

یہ دراصل نتیجہ ہوتا ہے خود احتسابی سے محرومی اور دعویٰ کا، ورنہ بات بالکل صاف ہے کہ استاد کے بغیر کسی بھی علم وفن کی نوعیت وحقیقت کا فہم نہیں ہوسکتا، روحانیت، دل کی صلاحیتوں کی بیداری اور محبوب حقیقی سے محبت میں ارتقا، اور نفسی قوتوں کا ادراک اور ان کی فنائیت اور باطنی بیماریوں کا شعور اور ان بیماریوں سے نجات کا تو سارا تعلق ہی روحانی استاد کی صحبت ومعیت سے ہے۔

بعض بڑے بڑے اہل علم اور اہل تحریک کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ نماز جیسے فرض کی ادائیگی میں سستی غالب رہتی ہے، صبح کی نماز تو قضا ہی ہوتی ہے، نیز زبان پر کنٹرول نہیں ہوتا۔

اس طرح کی کمزوریاں دراصل روحانی عدم فیض رسانی کا نتیجہ ہوتی ہے، جب کسی اہل اللہ کی صحبت نصیب ہوتی ہے تو آہستہ آہستہ اس طرح کی ساری بیماریوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس کی ایک توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ جس طرح بڑی بڑی مشینیں بھاری بوجھ اٹھالیتی ہیں، جو افراد کے بس کی بات نہیں ہوتی، اسی طرح حقیقی اہل اللہ مجاہدوں کی برکت سے اپنے دل کی توجہ ودل کی طاقت سے کمزور ایمان کے حامل افراد کی ایمانی حالت کی بہتری کا ذریعہ بنتے ہیں، بلکہ ان کے دل میں اللہ کی محبت کے جذبات کی آبیاری کرکے، انہیں ایمانی اعتبار سے مستحکم سے مستحکم تر بنانے کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ ایسا ہے، جسے سمجھے بغیر علم وعقل کے صاحبان کی شخصیت میں موجود خلا

دور ہو سکے اور ان کی شخصیت میں استحکام، توازن اور اعتدال پیدا ہوسکے، دشوار تر بات ہے۔

تصوف میں تین چیزوں کا شکاری کے جال کے مثل ہونا

تصوف میں تین چیزیں ایسی ہیں جو شکاری کے جال کی حیثیت رکھتی ہیں کہ جو شکاری پرندوں کی بولی سیکھ کر ان کی آواز میں، انہیں جال میں پھانسنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، وہ تین چیزیں یہ ہیں۔

یکم: شہرت کی کاوشوں کا ہونا، اس کے لئے مصنوعی طریقے اختیار کرنا، اس مقصد کے لئے میڈیا کے ذرائع کو پوری منصوبہ بندی کے ساتھ استعمال کرنا۔

دوم: زیادہ سے زیادہ مرید بنانے کی کاوشوں کا ہونا اور اس کے لئے ازحد فکرمند ہونا، کوششوں کے باوجود افراد، حلقہ ارادت میں شامل نہ ہوں تو اس پر تشویش میں مبتلا ہونا۔

سوم: زیادہ سے زیادہ مال بنانے کی کاوشوں کا ہونا اور اس مقصد کے لئے مالدار افراد سے خصوصی تعلقات قائم کرنا۔

اگر ان مقاصد کے لئے تسخیری وظائف اور قوت ارتکاز کی مشقوں سے بھی کام لیا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ شکاری پرندوں کی بولی میں پوری طرح مہارت حاصل کرچکا ہے۔

حقیقی تصوف میں بزرگان دین ہمیشہ شہرت سے بھاگتے رہے ہیں، اللہ نے ان کی آخری حد تک فنائیت کی وجہ سے انہیں شہرت دی ہے، لیکن انہوں نے شہرت کی نہ تو آرزو کی ہے اور نہ ہی اس کے لئے منصوبہ بندی سے کام لیا ہے۔

اسی طرح حقیقی اہل اللہ زہد، فقر اور دنیا واہل دنیا سے مستغنی رہے ہیں، وہ دولت کو اپنے قریب بھی آنے نہیں دیتے تھے، کتابوں میں ان کے فقر کی حالت دیکھ

کر فرد حیرت زدہ ہوجاتا ہے، حضرت فرید الدین شکر گنج کے ایک خلیفہ نے وقت کے بادشاہ کے قریبی مالدار کے تعاون سے اپنی خانقاہ تعمیر کی، کچھ عرصہ کے بعد وہ مالدار بادشاہ کے عتاب کا شکار ہوا تو یہ خلیفہ صاحب بھی عتاب میں آ گئے، موصوف نے شیخ کو توجہ اور دعا کی درخواست کی، آپ نے فرمایا، جو ہمارے اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ اسی سزا کا مستحق ہے۔''

بزرگان دین نے خانقاہیں بھی قائم کیں، لوگوں کی اصلاح کا فریضہ بھی سرانجام دیا، معاشرہ کو دینی واخلاقی اعتبار سے سہارا بھی دیا، ان کی خانقاہیں ہر دور میں آباد رہیں، ان کا یہ سارا کام توکل پر چلتا رہا، اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے حالات میں ان کے لئے راستہ ہموار کیا، حالانکہ بظاہر نہ تو ذرائع ووسائل تھے اور نہ ہی چندے جمع کرنے کی کوئی تحریک، اللہ نے ان کے بے پناہ اخلاص کی وجہ سے ان کے کام میں ایسی برکت عطا فرمائی کہ مالی وسائل کے اعتبار سے تہی دامنی کے باوجود ہر دور میں ان کا کام چلتا رہا، ان کے اخلاص واخلاق کی خوشبو دور دور تک پہنچتی رہی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا واقعہ ہے کہ چونکہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شاملی کے محاذ پر انگریز کے خلاف جنگ لڑی تھی، اس لئے ان کی خانقاہ کے بارے میں انگریز حکومت کو خطرہ تھا کہ کہیں وہ مستحکم نہ ہوں، چنانچہ انہوں نے ایک مسلمان جاسوس بھیجا کہ وہ جا کر دیکھیں کہ ان کی خانقاہ کو رقم کہاں سے مل رہی ہے، وہ صاحب چند دن وہاں رہے، حضرت مولانا سے رخصتی کے وقت انہوں نے مولانا کو نذرانے کے طور پر کچھ رقم دی، آپ نے وہ رقم قبول فرمائی اور ان سے کان میں کہا کہ ان سے کہنا کہ ان کا کام اسی طرح چلتا ہے، حقیقت ہے کہ یہ اہل اللہ ہمیشہ اللہ کی ذات پر توکل اور یقین کی قوت سے کام کرتے رہے ہیں اور ان کی ذاتی زندگی زہد وفقر سے عبارت رہی ہے۔

مجاہدوں کے ذریعہ نفس کی پلصراط طے کئے بغیر کام نہیں بنتا

نفس وشیطان کا ایک بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ متوسط صوفی کو اپنے بزرگ ہونے، اپنے مجاہدوں پر ناز کرنے اور دوسرے علماء وبزرگوں کی خامیوں وکوتاہیوں کی باتیں القا کرکے، ان کی تحقیر کی راہ پر لگا دیتا ہے، اس طرح اپنے مجاہدوں پر ناز کی نفسیات اتنی پختہ ہوجاتی ہے کہ وہ زندگی بھر اس سے باہر نکلنے نہیں پاتا۔ اس نفسیات کی وجہ سے اس کا سب سے محبوب مشغلہ معاشرہ کی خرابیوں میں علماء وصوفیا اور دوسروں کے کردار کا موضوع ہوتا ہے۔

نفس وشیطان کا یہ حربہ افراد پر اتنا غالب ہونے لگتا ہے کہ وہ اپنے افضل ہونے کی نفسیات میں جینے لگتے ہیں۔ اس طرح شیطان، مجاہدوں کے بہانے اور اپنی بزرگی کے روپ میں انہیں بڑے ہونے کی بیماری میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس نفسیاتی نوعیت کی بیماری کے نتیجہ میں متوسط صوفی زیادہ سے زیادہ مرید بنانے اور ان کے ذریعہ سے دولت جمع کرنے کے خبط میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

منتہی صوفی جو اپنے شیخ کی نگرانی میں غیر معمولی مجاہدوں کے ذریعہ نفس کو بڑی حد تک پامال کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے القائے شیطانی کے ان حملوں سے اس کے لئے بچاؤ کی صورت پیدا کردیتا ہے، وہ اغوائے شیطانی ونفسانی کے ان حملوں سے چوکنا ہوجاتا ہے۔ اور نفس کو ملامت کرکے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

لیکن طالب کو اگر قبل از وقت خلافت کی مسند حاصل ہوگئی اور وہ ذہنی وخطابتی صلاحیتوں کا بھی حامل ہے تو وہ اس معاملہ میں بُری طرح نفس وشیطان کے اغویٰ کا شکار ہوجاتا ہے اور وہ بزرگی کے روپ میں مارا جاتا ہے، چونکہ وہ نفس کی فنائیت کے کامل مراحل سے نہیں گذرا ہوتا ہے، اس لئے نفس کی مکروفریب کی گہرائیوں کی وسیع دنیا سے پوری طرح آشنا ہونے اور اس پر غلبہ پانے میں وہ کامیابی سے ہمکنار نہیں

ہوتا۔ نفس کی وسیع دنیا سے اس کی یہ ناآشنائی اسے بظاہر بڑے اخلاص کے ساتھ بڑے پن کے ساتھ ساتھ بزرگی کی راہ پر گامزن کردیتی ہے۔

اس دور میں جبکہ تصوف میں ذکر وفکر کے مجاہدوں کی روایت بہت کمزور پڑ چکی ہے اور صوفی غیرمعمولی مجاہدوں سے تھک جاتا ہے، اور نفس کے خلاف طویل عرصہ کی معرکہ آرائی کو مشکل ترین کام سمجھنے لگتا ہے، چنانچہ چند سال کے مجاہدوں کے نتیجہ میں اسے روحانی طور پر دوسروں کو متاثر کرنے اور وقتی تصرف کے ذریعہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچنے یا قبل از وقت کچھ واقعات معلوم ہونے کی جو صلاحیت اسے حاصل ہوتی ہے، وہ اس صلاحیت کو اپنی بزرگی کو مستحکم کرنے میں صرف کردیتا ہے۔

یہ موجودہ دور کے تصوف کا بڑا المیہ ہے، جو بزرگی کی مسند کو سستا کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔

تصوف نازک ترین چیز ہے، جس میں فرد وافراد کو نفس کی پلطراط سے گذارنے کا عمل جاری رہتا ہے، جو صبر وثبات اور حوصلہ وہمت اور مستقل مزاجی کا متقاضی ہے۔ اس راہ میں جلد بازی اور بے صبری کا مطلب فرد کے لئے نفس کی برپا کردہ آتش عشق میں جل جانا ہے، اور اس سے اوپر اٹھنے کی صورت کا ناپید ہونا ہے۔

یہ راہ انہی خوش نصیب افراد ہی کے لئے سجائی گئی ہے، جو استقامت سے آخری حد تک نفس سے معرکہ آرائی کرنے کے حوصلہ کے حامل ہوں اور جو نفس کے خلاف جنگ جوئی سے تھکنے اور حوصلہ ہارنے والے نہ ہوں، جو محض اور محض اللہ کی رضامندی اور آخرت میں اس کے سامنے سرخروئی کے جذبات واحساسات سے سرشار ہیں، ایسے خوش نصیب افراد ہی ہیں، جن کے لئے دونوں جہانوں کی سعادتوں کی راہیں کھلی ہیں، اللہ کی ذات سے توقع ہے اور دعا بھی کہ ہم جیسے سیہ کاروں اور ضعیفوں کو ایسے خوش نصیب افراد کی فہرست میں شامل فرمائے۔ (آمین)

اپنے نفس کی یاد دہانی کے لئے تصوف کے بنیادی اصولوں کی نشاندہی

تصوف اصولوں سے وابستہ ہے، اصولوں کی پاسداری نہ ہوگی یا ان پر عمل پیرا ہونے میں سستی واقع ہوگی تو فرد (یعنی بزرگ) خطرات سے دوچار ہوگا۔

بزرگوں نے اس سلسلہ میں جو اصول بیان فرمائے ہیں، ان کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

یکم۔ بزرگ کو چاہئے کہ وہ اپنی اصلاح کے کام سے آخر وقت تک غافل نہ ہو، اپنا مسلسل محاسبہ کرتا رہے، نفس بھروسہ کے ہرگز قابل نہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس کا بے لاگ محاسبہ کرتے رہنا ضروری ہے۔

دوم۔ ذکر وفکر کے مجاہدوں کو مسلسل جاری رکھنا چاہئے، دوسروں کی اصلاح وتربیت کی فکر سے اپنے مجاہدوں میں کمی ہرگز واقع نہ ہو، دوسری صورت میں نفس کو سر اٹھانے کا موقعہ ملے گا، اور فرد کی بزرگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

سوم۔ سلوک کی مکمل طور پر تکمیل یعنی فنائے نفس کی کامل تکمیل کے بغیر فرد کو خلافت نہیں دینی چاہئے۔ دوسری صورت میں اس کے نفسی جذبات میں ارتعاش وابھار آ سکتا ہے۔

چہارم۔ شہرت سے ہر ممکن حد تک بچنے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔ ورنہ فرد مارا جائے گا، اس لئے کہ شہرت سب سے بڑی آفت ہے۔ شہرت کے بعد فرد آپے میں رہ سکے، دشوار تر بات ہے۔ شہرت کے لئے منصوبہ بندی کرنا، یہ تو فرد کے لئے سم قاتل ہے، اس کی وجہ سے اسے دھکے دے کر اپنے در سے نکال دیا جاتا ہے۔ اور فرد کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

پنجم۔ دولت کی ہوس سے ہر ممکن حد تک بچنے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ سادہ رکھنا چاہئے، تاکہ اپنے حلقہ سے وابستہ افراد کو

سادہ زندگی کا پیغام ملتا رہے، مالداروں سے دوستانہ مراسم قائم رکھنا تو فرد کے لئے سب سے بڑے خطرے کی بات ہے، اس کی وجہ سے مالداروں والی راحت کی زندگی کو ہدف قرار دینے سے بچنا محال ہے۔

ششم۔ اپنے آپ کو سب سے زیادہ سیاہ کار اور حقیر سمجھنے کے احساس کا غالب ہونا چاہئے، اس لئے کہ نفس اپنے افضل اور بزرگ ہونے کے حوالے سے وار کرنا چاہتا ہے، اس طرح اسے اللہ کے قرب کے مقام سے گرانا چاہتا ہے۔ اللہ کے شانِ عظمت کے غلبہ کی وجہ سے سچا طالب ویسے بھی اس کی عظمت کے احساسات کے تلے دبے رہتا ہے۔

اگر اپنی بزرگی کے نقش نے غلبہ پانے میں کامیابی حاصل کر لی تو فرد سے نسبت کی اس نعمت کے سلب ہونے کا خطرہ درپیش ہوگا، اللہ کو بندہ کی سب سے بڑی ادا جو پسند ہے، وہ یہی ہے کہ وہ اس کی مخلوق میں سب سے زیادہ حقیر بن کر رہے۔ اس کے قرب کے سارے مقامات اس نفسیات کے پختہ ہونے سے ہی وابستہ ہیں۔

ہفتم۔ مریدوں ومعتقدوں سے مالی مفادات ہرگز وابستہ نہ ہونے چاہئے، اس کی آرزوؤں کا ہونا بھی نقصاندہ ہے، اس لئے کہ اس سے اس پاکیزہ ادارہ کا مادی ومالی آلودگیوں کی نذر ہونے کا خطرہ درپیش ہوتا ہے، جو طالب محبت کے جذبات کے زیر اثر مالی تعاون کرنا چاہیں، ان کا تعاون تو ضرور قبول کرنا چاہئے، لیکن روحانی استاد کو مالی مفادات کے جذبات کو پالنے سے محتاط ہونا چاہئے۔

بلکہ اس سلسلہ میں حضرت مجددؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص مرید ہونے کے لئے آئے، اسے اپنے لئے خطرہ سمجھنا چاہئے کہ کہیں اس کی نظر مرید کے مال پر نہ جائے، اس طرح وہ مرید اس کی ہلاکت کا باعث بن جائے۔

نہم۔ اپنے نام کے ساتھ شیخ المشائخ، پیر طریقت اور رہبر شریعت کے القابات چسپاں کرنا یا اپنے مریدوں میں اس طرح کا تحرک پیدا کرنا، بڑے خطرے کی بات ہے۔ اس سے رفتہ رفتہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے بزرگ بننے کی نفسیات پیدا ہونے، بلکہ اس نفسیات کے پختہ ہونے کا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔

دہم۔ تصوف کے ایسے دعویدار جو شان وشوکت کی زندگی گذارتے ہیں، جو شہرت کے لئے منصوبہ بندی کرتے ہوں اور جو بزرگی کے روپ میں سرمایہ دارانہ طرز عمل کے عامل وحامل ہوں، ان سے راہ ورسم رکھنا، انہیں اپنا آئیڈیل سمجھکر، انہی کی طرح کی شان ومان کی زندگی گزارنے کی ہوس کا ہونا، یہ ایسی بات ہے جو فرد کے لئے ہلاکت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

شان ومان کی یہ زندگی ایک تو سیرت پاک، صحابہ کرام، بزرگان دین اور سلف صالحین کی زندگی کے منافی ہے، دوسرے یہ کہ اس سے سرمایہ داروں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے، جو شخص جس طبقہ سے مشابہت پیدا کرتا ہے، وہ اسی گروہ کا حصہ ہوتا ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے اصول ایسے ہیں، جو راہ سلوک کی کامل طور پر تکمیل کے بعد طالب صادق کے دل پر ازخود نقش ہوجاتے ہیں، اسے ان بنیادی اصولوں کی توضیح کی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوتی۔ لیکن سلوک کی کامل طور پر تکمیل کا کام چونکہ انتہائی دشوار گذار کام ہے، جو اس دور میں بیس پچیس سال کے شب وروز مجاہدوں کے بغیر حاصل ہونا دشوار ہے، چنانچہ سرسری مجاہدوں سے خلافت کے منصب پر فائز ہونے والے افراد پر عام طور پر تصوف کے یہ بنیادی اصول وخطوط ونقوش واضح نہیں ہوتے۔ حجاباتِ نفس کی صورت میں ان اصولوں کا دل پر منکشف ہونا محال ہی ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہونا چاہئے کہ دل میں جب حب جاہ وحب مال، جذبۂ شہرت اور حرص وہوس کے اثرات موجود ہوں گے تو ان اثرات کی موجودگی کی وجہ سے دل سے اخلاص، للھیت و بے نفسی کی شعائیں طلبہ میں منتقل نہ ہوسکیں گی، اگرچہ ذکر کی کچھ عادت پیدا ہوجائے اور کچھ کیفیات بھی حاصل ہوجائیں، لیکن ان کے دلوں میں اخلاص وللھیت کی عکس ریزی پوری طرح نہ ہو سکے گی، اس طرح ایک تو بزرگ سے مخلص اور سچے طالب رفتہ رفتہ دور ہوتے جائیں گے اور ان کے حلقہ میں مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہے گا۔ دوسرے یہ کہ ایسے بزرگ سے طلبہ اگر زندگی بھر بھی وابستہ رہیں تو ان کے تزکیہ کا کام قابل ذکر حد تک نہ ہوسکے گا، اس لئے کہ بزرگ کے نفسی حجابات ان کی بہتر تربیت وتزکیہ کی راہ میں شدید حائل ثابت ہوں گے۔

یہ نکتہ ایسا ہے، جسے سمجھنے کے لئے طویل عرصہ تک اپنے اندر میں غوطہ زنی کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

ہم جیسے صوفیائے خام پر تین تفکرات کا غالب ہونا

اس دور میں ہم جیسے صوفیائے خام پر تین تفکرات غالب رہتی ہیں۔ ایک شہرت ونام نمود کی فکر کہ کسی طرح لوگوں میں ہماری بزرگی کا چرچہ ہوجائے۔ دوسرے زیادہ سے زیادہ مرید بنانے کی فکر اور اس کے لئے مریدوں اور خلیفوں کے ذریعہ منصوبہ بندی کے ساتھ کام کرنا، تیسرے مال بنانے کی فکر، تاکہ دنیا کے سامانِ راحت سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہوا جائے اس طرح سرمایہ داروں اور مالداروں کی صف میں شریک ہوا جاسکے۔

اس مقصد کے لئے صوفیائے خام تسخیری وظائف اور نظر میں تاثیری قوت پیدا کرنے کے لئے ہپناٹزم سے ملتی جلتی مشقوں کا بھی استعمال کرتے ہیں اور کچھ ذکر

وفکر کے مجاہدوں سے بھی کام لیتے ہیں، لیکن ان کے ذکر وفکر کے یہ مجاہدے پرائمری یا درمیانی نوعیت اور سطح کے ہوتے ہیں، جو خود ان کے اپنے تزکیہ کے لئے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔

اس طرح کے صوفیائے خام اپنے مریدوں میں ذکر وفکر کا کچھ نہ کچھ ذوق وشوق پیدا کرنے اور ان میں کسی حد تک قلبی کیفیات منتقل کرنے میں تو کامیاب ہوتے ہیں، لیکن یہ قلبی کیفیات وقتی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ جو راہ سلوک کی تکمیل میں معاون ثابت نہیں ہوتی۔

اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خوفیائے خام سے وابستہ افراد میں اخلاص، للھیت، بے نفسی، اور پاکیزہ احساسات کی پوری طرح عکس ریزی کا کام نہیں ہو پاتا، جو اصلاح نفس، تزکیہ اور فنائے نفس کے لئے ناگزیر ہے۔

حقیقی اہل اللہ اور صوفیائے خام کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ حقیقی اہل اللہ شہرت ونام ونمود سے بھاگتے ہیں۔ دوم یہ کہ انہیں افراد کو مرید بنانے کی فکر لاحق نہیں ہوتی، سوم یہ کہ ان کا دولت، سامان دنیا اور دولت کے بارے میں مزاج سرد ہو چکا ہوتا ہے، وہ سادگی اور سادہ زندگی ہی کو پسند کرتے ہیں، وہ اپنے خوشحال مریدوں کی کوششوں کے باوجود اپنی اس طرز زندگی میں تبدیلی نہیں کرتے، اس لئے کہ فقر کی زندگی رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہے۔

ایک اہم نکتہ جسے ہم جیسے صوفیائے خام کو سمجھنے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ اگر غیر معمولی مجاہدوں سے پہلے طلب کی بنا پر خلافت مل جائے یا بزرگ کی طرف سے حسن ظن کی بنا پر تو یہ خلافت فرد کے لئے اس وقت تک خطرے کا باعث ہے، جب تک طالب مجاہدوں کی بھٹی سے پوری طرح گذر کر، نفس کو مہذب بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا، تہذیب نفس اور دوسروں کی تربیت کے لئے مجاہدے ناگزیر ہیں،

اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔ سرسری مجاہدوں سے کام نہیں بنتا، اس طرح کے مجاہدوں کی ضرورت ہے، جس سے نفسی قوتیں پامال ہوجائیں اور خواہشاتِ نفس کی شدت اور ان کا زور ٹوٹ جائے۔ مجاہدوں کا کوئی بدل ہی نہیں ہے۔ اگر خطابت اور غیرمعمولی ذہنی وعلمی صلاحیتوں کی وجہ سے اس طرح کے خام صوفی کو مرید مل گئے تو وہ مرید ان کی اپنی اصلاح کے لئے حجاب بن جاتے ہیں اور وہ دعویٰ کی راہ پر گامزن ہوکر، آخر وقت تک اپنی اصلاح سے غافل ہوتا ہے اور مال بنانے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اگر توجہ دلانے سے اسے کچھ احساس ہوتا بھی ہے تو وہ مجاہدوں کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور وہ دعا اور فیض نظر کا امیدوار ہوتا ہے، حالانکہ اللہ نے فنائے نفس کا معاملہ ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں سے وابستہ کیا ہے، مجاہدوں سے فرار کی راہ دراصل نفس وشیطان کا سب سے بڑا دھوکہ ہے۔ اور مجاہدوں کی استعداد اہل اللہ کی طویل عرصہ کی صحبت ورابط کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی۔ اس طرح صحبت ومجاہدے ایک دوسرے کا لازمی حصہ ہیں۔

بزرگوں کے حالت زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے چالیس سال تک مجاہدوں سے کام لیا ہے تو کسی نے بیس سال تک، مجاہدے کسی سے بھی معاف نہیں ہوئے، مجاہدوں کے بعد ہی اللہ کے فضل سے صوفی میں وہ استعداد پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ دوسروں کی تربیت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور انہیں نفس مطمئنہ کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

مجاہدوں سے فرار اختیار کرنے والا صوفی نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لئے ہلاکت کا باعث بنتا ہے، اس لئے کہ اس کے رزائل نفس موجود ہوتے ہیں، جو خود تصوف واہل تصوف کے لئے بدنامی کا موجب بنتے ہیں۔ اس طرح تصوف کا ادارہ دکانداری کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔ ایسا صوفی اپنے مریدوں کی بہتر اور مؤثر

تربیت کرنے سے بھی قاصر ہوتا ہے۔

بڑی خوشی ومسرت کی بات یہ ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی ایسے ہزاروں سے زیادہ افراد موجود ہیں، جو نفس کے خلاف غیرمعمولی مجاہدوں میں مصروف ہیں، اللہ نے انہیں ایسا حوصلہ دیا ہے کہ وہ تھکنے کا نام نہیں لیتے، ایسے افراد چونکہ شہرت اور نام نمود کے مروجہ ذرائع سے دور ہیں اور وہ اپنے حالات کو لوگوں سے چھپائے ہوئے ہیں، اس لئے معاشرے میں موجود اس طرح کے خوش نصیب افراد کا عام طور پر کوئی تعارف موجود نہیں ہے۔

اس طرح کے خوش نصیب افراد سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے تو روح تسکین سے سرشار ہوجاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ اپنے زوال کے باوجود اس طرح کے اللہ کی محبت میں مستغرق اور صاحب کردار افراد کی وجہ سے ہی زندہ ہے اور عتاب سے بچا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں زندگی کی آخری سانسوں تک اپنی محبت کے ان رازدانوں کی معیت وصحبت نصیب فرمائے اور اسی پر قائم ودائم فرمائے۔ (آمین)

تصوف سے صاحب کردار افراد کے ملنے کی دشواری

(ایک سوال کے جواب میں)

ایک صاحب نے یہ سوال دریافت کیا ہے کہ زندگی کے مختلف مراحل پر تین چار بزرگوں سے میرا تعلق قائم ہوا، ہر بزرگ کی طرف سے ملنے والے ذکر پر خوب محنت کی، لیکن ذکر اور ان بزرگوں سے گہرے تعلقات کے باوجود دل میں دنیا کے حوالے سے سردمہری، آخرت کے لئے فکرمندی اور نفسی قوتوں کی گہرائی وشدت کے احساس جیسی چیزیں بالکل بھی حاصل نہ ہوئیں۔ لیکن آخر میں ایک صاحب دل شخص سے تعلق قائم ہوا اور ان سے ذکر بھی لیا تو یہ ساری چیزیں ازخود پیدا ہونا شروع

ہوئیں۔ اس پر مجھے بہت زیادہ حیرت ہوئی کہ ان بزرگوں اور نئے صاحب دل شخصیت سے صحبت کے درمیان اتنا فرق کیسے اور کیوں کر ہوا۔

موصوف نے اس سوال پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے لئے کہا ہے۔

ہماری نظر میں یہ تو اللہ کا فضل خاص ہوتا ہے کہ کسی صاحب دل شخصیت سے بھرپور استفادہ ہو اور دل دنیا سے سرد ہونے ہونے لگے۔ اس گئے گزرے دور میں بھی اس طرح حقیقی اہل اللہ کافی موجود ہیں۔

اس کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس وقت آپ پہلے بزرگوں سے بیعت ہوئے تھے اور ان کا دیا ہوا ذکر شروع کیا تھا، اس وقت تصوف کے بارے میں آپ کا نقطہ نگاہ خود واضح نہ ہو، آپ تصوف کو خالی ذکر وفکر سمجھتے ہوں، اسے حب جاہ وحب مال کے ازالہ کا ذریعہ نہ سمجھتے ہوں، ممکن ہے اس وجہ سے بھی آپ کو اس وقت ان بزرگوں کی صحبت سے رزائل نفس کے ازالہ میں فائدہ نہ ہوا ہو۔

اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ بھرپور روحانی استفادہ اور باطنی بیماریوں سے بچاؤ کا تعلق بقاباللہ کی حامل شخصیت کی صحبت سے ہوتا ہے۔ یعنی جو شخصیت نفس کی فنائیت اور خواہشات کی پامالی کے سارے مراحل طے کرکے اللہ کے ساتھ بقا کی حالت پر مستحکم ہوگئی ہو۔

بزرگان دین کے ملفوظات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طالب سلوک کے اسباق کامل طور پر طے کرکے، بڑی حد تک نفس کے تزکیہ میں کامیاب نہیں ہوتا، اور اسے سلوک کی تکمیل سے پہلے ہی خلافت عطا کردی جاتی ہے یا وہ خلافت کی مسند پر فائز ہوجاتا ہے تو اس طرح کی شخصیت سے بیعت وصحبت سے ذکر کی توفیق تو کسی حد تک ملنے لگتی ہے، کچھ کیفیات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ ظاہری زندگی میں بھی کچھ تبدیلی آنے لگتی ہے، لیکن چونکہ بزرگ کا تزکیہ مکمل نہیں ہوا ہوتا، اس کی فنائیت

کے مراحل کی تکمیل نہیں ہوئی ہوتی، حب جاہ وحب مال کے اثرات اس کے باطن کی گہرائیوں میں موجود ہوتے ہیں، اس لئے طالب، اس کے باطن کی عکاسی کے اثرات سے محفوظ ہو سکے، مشکل ہے، چونکہ اُس نے ذکر پر ایک حد تک محنت کی تھی، لیکن ذکر کے یہ مجاہدے اسے حالت فنا سے حالت بقا تک لانے کے قابل نہیں تھے، اس لئے اس کے باطن میں رزائل نفس موجود رہے، نفس کی ان خرابیوں کی موجوگی میں تزکیہ کے خواہشمند طالب، جب اس سے بیعت ہوکر ذکر کریں گے تو ان کا ذکر کا سلسلہ تو شروع ہوجائے گا، لیکن انہیں روحانی ارتقا نصیب نہ ہوسکے گی اور ان کے باطن کی قابل ذکر حد تک اصلاح نہ ہو سکے گی، نیز ان کی سیرت وکردار اور اخلاق میں پاکیزگی پیدا نہ ہو سکے گی، یہ وہ بہت اہم نکتہ ہے، جسے عام طور پر اس دور میں سمجھنے میں ناکامی ہوئی ہے۔

اس دور میں چونکہ ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدے (جس سے نفس پامال ہوتا ہے اور صحبت جس سے کردار کی منتقلی کا عمل جاری ہوتا ہے) وہ مفقود ہوگئے ہیں اور خلیفوں کی کثرت ہونے لگی ہے، چنانچہ مجاہدوں کے فقدان اور سلوک کی کامل طور پر تکمیل کے بغیر خلافت یافتہ بزرگوں سے زندگی بھر وابستگی کے باوجود کچھ ذکر اور کچھ کیفیات تو نصیب ہوں گی، ایک حد تک ظاہری تبدیلی بھی ہوگی، لیکن نفسی قوتوں کے مکر وفریب کی ہزارہا واردات سے آشنائی ہوسکے اور اندر کا مفتی اتنا طاقتور ہوسکے کہ زندگی کے ہر معاملہ میں اس کا فتویٰ طاقتور ہوکر، طالب کے لئے نفسی خرابیوں سے بچاؤ اور کامل تزکیہ کی صورت پیدا ہو سکے، محال ہے۔

اس طرح کے بزرگ سے وابستگی کے نتیجہ میں اس کے قلب کی گہرائیوں میں موجود حب جاہ وحب مال کے اثرات سے بچاؤ کی صورت کا پیدا ہونا دشوار تر ہوگا۔

اس سے ایک اہم نکتہ جو واضح ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ تزکیہ مربی ومزکی کرتا ہے،

ناقص مربی چونکہ اپنے تزکیہ میں ناکام ہوتا ہے، اس لئے وہ دوسروں کے تزکیہ کی صلاحیت سے قاصر ہوتا ہے۔

جہاں بھی دولت کی خواہش موجود ہوگی، شہرت کے جذبات اور اس کی کاوشیں ہوں گی، وہاں یہی صورتحال قائم رہے گی، اس لئے تزکیہ کے لئے ضروری ہے کہ ایسی شخصیت کی تلاش ہو، جس پر زہد، فقر، دنیا سے استغنا، عاجزی، انکساری، فنائیت، طالبوں سے محبت، ذکر سے طبعی مناسبت اور دنیا میں کم سے کم الجھنے جیسی چیزیں موجود ہوں، اس طرح کی شخصیتیں ہی سلوک کی تکمیل کا حاصل ونتیجہ ہوتی ہیں۔ حقیقی فیض ایسی حالت بقا کی حامل شخصیتوں ہی سے مل سکتا ہے۔

آپ کے اطمینان کے لئے یہ مختصر نکات لکھے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عاجز کی بھی اصلاح کی صورت پیدا فرمائے۔ (آمین)

مراقبہ کی راہ میں حائل بعض مشکلات اور ان کا حل

کسی اہل اللہ کی صحبت ومعیت میں اسم ذات کا مراقبہ شروع کرنے کے بعد طالب کو بعض مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے، جسے سمجھکر حوصلہ وہمت اور صبر سے اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

سب سے بڑی مشکل تو یہ درپیش ہوتی ہے کہ مراقبہ سے طالب کی نفسی قوتوں کے ساتھ معرکہ آرائی شروع ہوجاتی ہے۔ اور نفس کی گہرائیوں سے حب جاہ حب مال اور حرص وہوس اور حسد کے جذبات ابل کر سامنے آتے ہیں، جو طالب کے خیالات کو منتشر کردیتے ہیں اور اس کے مراقبہ میں ارتکاز قوت پیدا ہونے نہیں دیتے، جس سے طالب بہت پریشان ہونے لگتا ہے۔ آدھے گھنٹے کے مراقبہ میں پندرہ منٹ تو اس کے نفس کے پیدا کردہ وسوسوں کی نذر ہوجاتے ہیں۔

دوسری مشکل جو طالب کو درپیش ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ لاشعور میں موجود زندگی بھر کے واقعات، یادیں اور سیاہ کاریاں وغیرہ سب ادلی بدلی ہوئی صورت میں اس کے سامنے آکر، اس کے مراقبہ میں خلل پیدا کردیتی ہیں اور بڑی مشکل سے اس کے مراقبہ کا دورانیہ پورا ہوجاتا ہے۔

تیسری مشکل یہ ہے کہ مادہ پرستی کی قوتیں جس کے مناظر وہ روزانہ اخبارات، میڈیا، راستوں پر لگے ہوئے بڑے بڑے بورڈوں وغیرہ کی شکل میں وہ دیکھتا ہے، یہ مظاہر سامنے آکر، اس کے مراقبہ کی راہ میں حائل ہوجاتے ہیں۔

چوتھی مشکل یہ ہے کہ وہ کاروبار، ملازمت یا جس پیشہ سے بھی وابستہ ہے، اس پیشہ کی مصروفیات اور اس پیشہ کے دوران ہونے والے واقعات اور باتیں پوری شدت سے سامنے آکر، اس کے مراقبہ کو منتشر کرنے کا موجب بن جاتی ہیں۔

پانچویں مشکل یہ ہے کہ طالب اگر غریب ہے تو غربت کے نادیدہ مناظر ومظاہر خطرات کی صورت میں آکر، اس کے مراقبہ کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

مراقبہ میں ارتکاز قوت کی صلاحیت نہ ہونے کے وجہ سے طالب پر جلد ہی اشتعال کی حالت طاری ہونے لگتی ہے اور وہ اداسی اور خوداعتمادی کے بحران کا شکار بھی ہونے لگتا ہے۔ مبتدی طالب کی یہ مشکلات ایسی ہیں، جو اسے شروع میں شدید مشکلات میں ڈال دیتی ہیں۔ لیکن اس طرح کے حالات میں طالب کو پریشان ہونے کی قطعا ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ کی محبت کی راہ میں شروع میں طالب کے لئے یہ مشکلات اس راہ کا لازمی نتیجہ ہیں، ان مشکلات کی شدت بمشکل چند ماہ تک جاری رہتی ہیں، جب طالب حوصلہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان ساری مشکلات کے باوجود مراقبہ کو جاری رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے تو اسے جلد ہی ذکر

ومراقبہ کی حلاوت کے اجزاء نصیب ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور اس کی ساری مشکلات میں بتدریج آسانیاں پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔

اسم ذات کا ذکر دراصل نفس امارہ کی قوت کو ضرب کاری لگا کر، اسے شروع میں نفس لوامہ کی صورت میں لاتا ہے، آخر میں نفس مطمئنہ تک پہنچانے کا موجب بنتا ہے۔

شروع میں مراقبہ سے وسوسوں کے غلبہ ہونے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ نفس کی گہرائیوں میں جو بھی کثافتیں، کدورتیں اور گند موجود ہوتا ہے، ذکر کے نور سے یہ گند اندر سے نکلنا شروع ہوجاتا ہے اور باطن کی صفائی کے عمل کے بغیر دل پر مراقبہ کے اثرات قائم نہیں ہو سکتے۔

مراقبہ کا سب سے بہتر وقت تہجد کا وقت ہے۔ اس وقت زمین پر انوار کا نزول زیادہ ہوتا ہے، دل اور ذہن میں فضا کے یہ اثرات موجود رہتے ہیں، اس وقت دل کی اخذ مراقبہ کی صلاحیت میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے، مراقبہ کا دوسرا موزن وقت صبح کی نماز کے بعد کا ہے۔

دفتر اور کاروبار جانے سے پہلے شروع میں آدھا گھنٹہ آگے چل کر ایک گھنٹہ تک کا مراقبہ کرنا ضروری ہے، اس سے کاروباری الجھنوں، رکاوٹوں اور مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور اشتعال، جھنجھلاہٹ اور ضد وغیرہ جیسی بیماریوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کاروبار وملازمت، فرد کے لئے باعث خیر وبرکت ثابت ہوتے ہیں۔

مراقبہ میں پیدا ہونے والی مشکلات سے بچاؤ کی بہترین صورت یہ ہے کہ طالب مسلسل روحانی استاد سے رابطہ میں رہے، اس سے رابطہ کی وجہ سے اس کے دل سے نکلی ہوئی طاقتور شعائیں منتقل ہوکر اس کے دل کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوں

گی۔

مراقبہ کی راہ میں حائل مشکلات سے بچاؤ کی دوسری صورت یہ ہے کہ طالب مراقبہ کے عمل اور دورانیہ میں آہستہ آہستہ اضافہ کرتا رہے۔ اس سے دل اپنی اصل غذا سے مانوس تر ہوتا جائے گا۔ ایک وقت آئے گا کہ دل اپنی اصل غذا پر ٹوٹ پڑے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ طالب شروع میں دوچار ماہ تک اپنے روزمرہ کاموں میں جتنی تخفیف کر سکتا ہے۔ اسے کرنی چاہئے، تاکہ کاموں کے دباؤ کی وجہ سے مراقبہ میں حائل دشواری دور ہوسکے اور مراقبہ میں آسانی کی صورت پیدا ہو سکے، اور مراقبہ کا ملکہ کسی حد تک راسخ ہو سکے۔

یاد رکھیں کہ اسم ذات کا مراقبہ دین ودنیا کی جملہ سعادتوں کا ذریعہ ہے، جس دل میں اسم ذات کی تجلیات مستحکم ہوں گی، وہ حالت ومسائلِ زندگی میں نہ تو متزلزل ہوسکتا ہے اور نہ ہی حیران وپریشان، اس طرح کے سارے حالات اور بحرانوں کے مواقع پر اللہ کا ذکر اسے تھام لیتا ہے اور اسے اٹھا کھڑا کر دیتا ہے۔

اسم ذات کے ذکر کے تکرار سے فرد کی زندگی سکون وسکینت سے بہرہ ور ہوجاتی ہے۔ وہ خوداعتمادی سے سرشار ہوجاتا ہے، وہ زندگی کے ہر موڑ پر صبر وشکر کا حامل ہوجاتا ہے، اس کا ذہنی سکون قائم رہتا ہے۔ بڑے سے بڑے مسائل بھی اس کے ذہنی سکون میں خلل ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوتے، نیز اس کے لئے اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا آسان ہوجاتا ہے۔ سنجیدگی، وقار، اعتدال، تحمل وبردباری اس کے مزاج کا حصہ ہونے لگتے ہیں۔

حدیث شریف ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی، جب تک دنیا میں ایک بھی فرد اللہ اللہ کرنے والا موجود ہوگا، دوسری حدیث شریف ہے کہ بندہ مؤمن کو جنت میں کوئی

حسرت نہ ہوگی، سوائے اس حسرت کے کہ دنیا میں اس کا جو وقت ذکر کے بغیر گزرا، وہ کیوں گذرا؟

جو ذکر اتنے زبردست ثمرات کا حامل ہو، اس ذکر کی راہ میں حائل ساری رکاوٹوں کو دور کرکے ذکر میں آگے بڑھتے رہنا، ضروری ہے، یہ فرد کی خوش نصیبی بھی ہے تو اس کی سب سے بڑی دانشمندی کی علامت بھی۔

عارضی دنیا میں ذکر سے اعراض کرکے راحت کے سامان میں وقت ضایع کرنا، سب سے بڑی محرومی اور غیر دانشمندی کی علامت ہے۔

ذکر آہستہ آہستہ دل میں اپنا مقام بناتا ہے، نفس، دل اور دماغ کو بُری طرح یرغمال بنالیتا ہے، دل ذہن اور روح کو نفس کی اس یرغمالی سے بچانا آسان کام نہیں ہے، اس کے لئے ہمت وحوصلہ اور مستقل مزاجی سے کام لینا پڑتا ہے۔

محبت اور اس کی خصوصیات

اللہ کی محبت کی راہ جہاں سعادت داریں کی راہ ہے، وہاں یہ راہ مشکلات سے بھری ہوئی بھی ہے، اللہ کی محبت کے ذریعہ ایک تو نفس سے مقابلہ درپیش ہوتا ہے، دوم مادی قوتوں سے معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے، تیسرے اللہ کی مختلف صفات کے عکسوں سے گذرتے رہنے کی وجہ سے طالب کی کیفیات میں بہت ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے اکابر بزرگوں نے اس محبت کے بارے میں اپنی آرا ظاہر فرمائی ہے، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ دنیا میں جہاں بھی دکھ، درد اور غم موجود تھے، ان سب کو ایک جگہ جمع کرکے، ان کا نام عشق رکھ دیا گیا۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی فرماتے ہیں

الفت کیا ہے؟
ارے یارو، قیامت ہے، قیامت ہے قیامت

قیامت خیز اس منظر سے گذرے بغیر طالب کے لئے فتوحات کے دروازے نہیں کھلتے۔ اگر زندگی کی حقیقت اور اس کی نوعیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی کی کل حیثیت بلبلے سے مختلف نہیں۔ اگر بلبلہ والی یہ مختصر زندگی اللہ کی محبت اور اس کے عشق میں گزرے اور اس کے نتیجہ میں محبوب کی دائمی رضامندی اور اس کا مشاہدہ حاصل ہوتو یہ تو بہت ہی زیادہ سستا سودا ہے۔ اتنا سستا سودا کہ اس سے زیادہ سستا سودا دوسرا کوئی ہونہیں سکتا۔

اللہ کی محبت یقینا اللہ کے جلالی صفات کو اپنے ساتھ لاتی ہے، تاکہ جلالی صفات کے تیروں سے نفسی قوتیں پاش پاش ہوتی رہیں، لیکن ساتھ ساتھ اللہ کی محبت اپنے ساتھ جو حلاوت لاتی ہے، وہ ایسی حلاوت ہے، جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہ حلاوت ہی تو ہے، جس نے لاکھوں اللہ والوں کو اللہ کی محبت کی خاطر زندگی وقف کرنے پر مجبور کیا اور انہوں نے دنیا کی طرف دیکھنا ہی گوارا نہ کیا۔

یہ محبت جب ارتقا پذیر ہوتی ہے تو طالب کو احساس ہوتا ہے کہ اسے کتنی بڑی نعمت ملی ہے۔ اس نعمت کی خاطر ایک نہیں اگر سو زندگیاں بھی حامل ہوں تو انہیں قربان کرنا سستا سودا ہے۔

بس ایک مرتبہ اللہ کی محبت کی حلاوت سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد محبت کی کشش فرد کو خود بخود اس راہ کے ارتقائی مراحل طے کرانے کا ذریعہ بنے گی۔ اس لئے کہ راہ محبت میں حاصل ہونے والی لذت ایسی ہوتی ہے، جس کے مقابلہ میں مشکلات ہیچ ہوتی ہیں اور یہی مشکلات طالب کے لئے محبوب تک رسائی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

اللہ کی محبت چونکہ فطرت کا سب سے طاقتور داعیہ ہے، اس لئے اس سے ایک تو فطرت میں موجود سارے جذبات کی تسکین وتشفی ہوتی ہے، دوم یہ کہ اس سے

بندہ مومن کے اندر وہ سارے کمالات وصفات اجاگر ہونا شروع ہوتے ہیں، جو انسانیت کے شایان شان ہے۔ لیکن اللہ محبوب والہانہ محبت چاہتا ہے، ایسی محبت جو دوسری ساری محبتوں پر غالب ہو۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا شعر ہے۔

اکیوں سے ئی دار جن سے پسیں پرین کی
دوسری دانھن کیم نھار سچٹ ریساٹو بہت

دل کی آنکھیں اور ان کی ہیبت ایسی بنالو، جن سے محبوب کے علاوہ کسی اور کی طرف نہ دیکھ سکو۔ اس لئے کہ محبوب بہت زیادہ غیرتمند ہے، وہ تمہارا دوسری طرف دیکھنا برداشت نہیں کرسکتا۔

محبت جب رفتہ رفتہ ارتقا پذیر ہوتی ہے تو محبوب ہی اصل معبود اور اصل مقصود بن جاتا ہے، اس سے پہلے محبت میں ملاوٹ شامل ہوتی ہے، وہ محبت قابل قبول نہیں ہوتی، محبت کا لازمی نتیجہ اطاعت ہوتی ہے۔ پھر پوری زندگی محبوبِ حقیقی کی اطاعت میں بسر ہونے لگتی ہے۔ اطاعت کے بغیر بندہ مؤمن کو چین ہی نصیب نہیں ہوتا۔

محبت جب ارتقا پذیر ہوتی ہے تو وہ اپنے ساتھ معرفت، تقویٰ، خشیت اور باطنی نکات کا خزانہ بھی لاتی ہے، جس سے بندہ مومن کا دل معرفت کے علوم سے سرشار ہوجاتا ہے، اس سے بہتر سے بہتر نکات کا القا ہوتا رہتا ہے، یہ علوم اسے دل کے مفتی کے طاقتور ہونے سے حاصل ہوتے ہیں۔

اللہ کی محبت میں سب سے اہم کردار شیخ کا ہوتا ہے، جو خود طویل عرصہ کے مجاہدوں کے عمل سے محبت میں فنا ہوتا ہے، اس کے باطن میں اللہ کی محبت کی بے پناہ حرارت وگرمی موجود ہوتی ہے۔ اس کی صحبت سے طالب میں حرارت منتقل ہوکر، اس کے محبت کے سفر کو فروزاں تر کردیتی ہے۔ دوسرا کردار ذکر کا ہوتا ہے، جو طالب میں اللہ کے لئے اضطراب پیدا کردیتا ہے، یہ دونوں چیزیں مل کر طالب کے

محبت کے عمل کو فروغ پذیر دینے کا موجب بنتی ہیں۔

اہل اللہ کے خوف وخطر وفنائیت کی حالت

حکایات رومی میں ایک اہل اللہ کا قصہ ہے کہ وہ اپنے بعض مریدوں کے ساتھ راستہ میں جارہے تھے تو ایک گھر کے اوپر کے حصہ سے ایک عورت نے خاک کا ٹوکرا ان بزرگ پر پھینک دیا، بزرگ کا چہرہ اور لباس خاک میں لت پت ہوگئے، مریدوں میں باتیں ہونے لگی تو بزرگ نے فرمایا کہ میں تو آگ کا مستحق تھا، شکر ہے کہ آگ کے مستحق فرد کو اس معمولی سزا دینے پر اکتفا کیا گیا۔

اہل اللہ کے اس طرح کے بہت سارے واقعات کتابوں میں نظر سے گذرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی شان عظمت کے گہرے احساس اور فنائیت کی وجہ سے وہ اکثر خوف وخطر کی حالت میں رہتے ہیں۔ وہ جب اللہ کی شان عظمت کو دیکھتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں اپنے مظاہر عبدیت کو دیکھتے ہیں تو وہ کانپ جاتے ہیں کہ کہیں اسے مسترد نہ کردیا جائے اور وہ عتاب کا مستحق نہ ٹھہریں، اس لئے حقیقی اہل اللہ کے ہاں دعویٰ نہیں ہوتا، بلکہ عاجزی، فنائیت اور اپنی سیہ کاری کا احساس غالب ہوتا ہے۔ وہ اس برتر ہستی سے لرزاں وترساں رہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ قیامت میں سزا سے بچ جائیں، انعام کے مستحق نہ ٹھہریں تو یہی ان کی سب سے بڑی سعادت ہے، اس لئے کہ نفس کے خلاف مجاہدوں کے دوران انہیں اپنی نفسی قوتوں کے مشاہدے اور محبوب کی طرف سے جلالی صفات کے عکس اور زندگی بھر اللہ سے ان کا جو معاملہ ہوتا ہے، وہ انہیں بے چین کردیتے ہیں کہ انہیں ایسی شان جلال ہستی سے واسطہ ہے، جو بے مثال ہے، وہ عتاب پر آجائے تو اس کے عتاب سے کوئی بچ نہیں سکتا، وہ بخشش پر آجائے تو بڑے سے بڑے فاسق کی کسی ادا پر اسے بخش دیتا ہے، اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا، اور نہ اس کے سامنے کسی کو اف

کہنے کی مجال ہے۔

اہل اللہ کے خوف وخطر، فنائیت اور اللہ کے سامنے اپنے آپ کو لاشی سمجھنے کا احساس ایسا ہے، جسے دیکھکر بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ وہی قابل رحم ہیں۔ اس سلسلہ میں اہل اللہ سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم اس شاہی دربار کے سامنے پیش ہونے کے کچھ نہ کچھ سلیقہ سے آشنا ہوسکیں، اس عالی دربار کو بندہ کی سب سے بڑی ادا جو پسند ہے، وہ یہی ہے کہ ساری زندگی عبدیت میں گذارنے کے باوجود اپنی عبادت اور ذکر وفکر کو ہیچ سمجھا جائے اور احساسِ دعویٰ کو اپنے قریب بھی نہ آنے دیا جائے۔ یہ ادا ایسی ہے، جو اہل اللہ ہی کا شان ہے، اسی وجہ سے وہ قرب کے مقامات سے نوازے جاتے ہیں۔

صوفی کو احتیاطی تدابیر کی ضرورت

تصوف کی راہ ایسی ہے، جس میں صوفی کو موت تک احتیاط کی ضرورت ہے، احتیاط کا دامن چھوٹتے ہی ہی صوفی خطرہ کی زد میں آجاتا ہے، سب سے زیادہ دل کی احتیاط ہے کہ اس میں غیر کے جذبات پرورش نہ پانے لگیں، پھر مالداروں کی صحبت ودوستی سے بچاؤ کی احتیاط ہے کہ کہیں ان کی دوستی اسے مال اور دنیا داری کی راہ پر نہ لگادے، زبان کی احتیاط ہے کہ کہیں غیرضروری گفتگو اور معاصر شخصیتوں کے بارے میں حاسدانہ گفتگو اس کے دل کو سیاہ نہ کردے، اس طرح وہ محبوب سے دور ہوجائے۔ غلط مفکروں کی فکر کے مطالعہ سے احتیاط کی ضرورت بھی لاحق رہتی ہے کہ کہیں ان کی فکر صوفی کو ذہنی طور پر سلف کی فکر سے دور نہ کردے، مریدوں کے مال پر للچائی ہوئی نگاہ ڈالنے سے احتیاط کی بھی ضرورت ہے کہ کہیں یہ للچائی ہوئی نگاہ اس کے لئے آفت نہ بن جائے، جذبۂ شہرت ونام ونمود سے بچنے کی بھی سخت ضرورت ہے کہ کہیں وہ پیر طریقت اور رہبر شریعت اور قطب الاقطاب ہونے کی روحانی

بیماری کا شکار نہ ہوجائے، اس طرح یہ روحانی بیماری اسے محبوب سے دور کرنے کا ذریعہ بنے، بازاری لوگوں سے بچنے کی بھی ضرورت ہے کہ کہیں وہ ان کے اثرات کی زد میں نہ آجائے۔ حرص وہوس کے جذبات کو پالنے سے بچنے کی بھی ضرورت ہے کہ کہیں یہ جذبات اس کی بزرگی کے لئے خطرہ نہ بن جائے۔

اللہ کے طالبوں سے ملاقات کے لئے اپنے دروازے بند کرنے سے بچنے کی بھی سخت ضرورت ہے کہ کہیں اس سے جذبہ بڑائی پیدا نہ ہوجائے اور بزرگی سلب ہونے کا خطرہ لاحق نہ ہوجائے، اس لئے کہ بزرگی کا مطلب ہی یہی ہے کہ صوفی کی اب سب سے بڑی مصروفیت طالبوں کی تربیت اور ان سے رابطہ وملاقات میں فراخ دلی سے کام لینا ہے، قرآنی نص موجود ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهُ وَلَا تَعْدُ عَیْنَاکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیَاةِ الدُّنْیَا . (اور اپنے آپ کو ان کے افراد کے ساتھ بیٹھنے کا پابند بنالے جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں جو اللہ کی رضامندی چاہتے ہیں اور ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ جو دنیاوی زندگی کی زینت چاہتے ہیں)۔

صوفی کو دنیاداروں کی طرح راحت کے سامان اور آسائش کی زندگی سے بچنے کی بھی سخت ضرورت ہے کہ کہیں دنیاداروں سے مشابہت کی وجہ سے محبوب اسے اپنے در سے دور نہ کردے، صوفی کو ہر طرح کی دعویٰ سے بچنے کے لئے بھی کوشاں ہونا چاہئے کہ کہیں دعویٰ اسے اپنی افضلیت کی راہ پر گامزن نہ کردے۔

یہ اور اس طرح کی بہت ساری چیزیں ہیں، جن کے بارے میں صوفی کی احتیاط اور حساسیت ضروری ہے۔

موجودہ دور میں اس معاملہ میں عمومی طور پر عدم احتیاط کی وجہ سے اہل تصوف، سلف کے تصوف کی بدنامی کا ذریعہ بن گیا ہے، اس طرح تصوف واہل تصوف کا وقار سخت مجروح ہوگیا ہے۔

اگرچہ طویل عرصہ تک حقیقی اہل اللہ کی صحبت اور برسوں کے شب وروز کے ذکر وفکر کے مجاہدوں اور راہ سلوک کے اسباق پر محنت میں وہ صلاحیت موجود ہے کہ نفس کی حالتِ فنا کے بعد حالتِ بقا میں آنے کے نتیجہ میں صوفی میں اتنی روحانی قوت پیدا ہوجاتی ہے کہ اس کے لئے ان ساری خرابیوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوجاتی ہے، محبوب کے لئے صوفی کے غیرمعمولی مجاہدے اسے اتنے پسند ہیں کہ ان کے صدقہ میں محبوب اسے لوگوں کے لئے مثالی فرد کی حیثیت سے سامنے لاتا ہے، تاکہ افراد اس کی زندگی کے نمونے کو دیکھکر اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کے لئے کوشاں ہوں، لیکن بدقسمتی سے اس دور میں عام طور پر ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں میں تخفیف کرکے، خلافت وبزرگی کو بہت سستا کر دیا گیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ بزرگی کے نام پر شان وشوکت کا مظاہرہ بھی ہے تو نام ونمود اور شہرت کی کاوشیں بھی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مرید بنانے کی دوڑ بھی ہے تو مالداروں سے دوستانہ تعلقات وروابط بھی ہیں۔ اور مال بنانے کی سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔

تصوف میں یہ ساری خرابیاں سلف کے سلوک پر مطلوبہ مجاہدوں میں تخفیف ہی کا نتیجہ ہیں۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ موجودہ دور کی مادیت کی خوفناک طوفانی لہروں اور نفسی قوتوں کے غیرمعمولی اشتعال کی وجہ سے ذکر وفکر کے مجاہدوں میں پہلے کے مقابلہ میں مزید اضافہ ہوتا۔

کچھ دکھ سے بھرے ہوئے واقعات

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس گروہ اور جس طبقہ میں دولت آئے گی (کثرت دولت) وہاں دشمنی پیدا ہوگی (یعنی دولت کی وجہ سے ان کے درمیاں تصادم پیدا ہوگا) ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ علماء دین کے امین ہیں، تب تک جب تک وہ مالداروں سے تعلقات استوار نہیں کرتے، جب وہ مالداروں سے تعلقات قائم کریں گے تو وہ دین کے رہزن بن جائیں گے۔

اللہ کے رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ مبارک ایسے ہیں، جو ہر دور میں صحیح

ثابت ہوئے ہیں۔ سیاستدانوں، اقتدار کے صاحبوں، بڑے افسروں اور صنعتکاروں کے خاندانوں کے حالات کا جائزہ لیں گے تو ان احادیث کے اثرات سو فیصد نظر آئیں گے، یہاں تک کہ جن اللہ والوں نے اپنی ساری زندگیاں لوگوں کی تعلیم وتربیت واصلاح اور زہد وفقر ودرویشی کی حالت میں گزاری، ان کی جس اولاد نے ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدے کرکے، نفس کی بہیمانہ قوت کو مطیع نہیں کیا، ان میں حب مال وحب جاہ کے اثرات غالب رہے، ایسے اہل اللہ کی اولاد پر بھی رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ صادق نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ڈرتے اور کانپتے ہوئے بوجھل دل کے ساتھ ذیل میں کچھ واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ مال کی محبت کے اثرات بد کا ادراک پیدا ہو، اور اس سے بچاؤ کے لئے حقیقی فکرمندی پیدا ہو۔

سندھ کے ایک بڑے اہل اللہ تھے (جن کا اب وصال ہوچکا ہے) جن کی تقویٰ، زہد، سادگی اور درویشی مسلمہ تھی، بلکہ وہ آخری دور کے چند مثالی بزرگوں میں شامل تھے، ان کے فرزند ارجمند نے ان کے ایک قریبی تعلقات کے حامل مرید کے ذریعہ درخواست کی کہ ہمارے گاؤں کے قریب فلاں زمین بک رہی ہے، وہ ہم لینا چاہتے ہیں، آپ کی رضامندی چاہئے، بزرگ نے اپنے فرزند سے کہا کہ ہمارے پاس جو زمین ہے، الحمدللہ اس سے اتنا اناج آرہا ہے کہ ہمیں اناج خریدنے کی ضرورت ہی لاحق نہیں اور نہ انشاء اللہ آئندہ ضرورت پیش آئے گی۔

بزرگ نے مزید فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو جو ہمارے شیخ کے وصال کے بعد ان کی اولاد کے درمیاں ہوا، مرید نے دریافت کیا، یا حضرت آپ کے شیخ کی اولاد کے درمیاں کیا ہوا، فرمایا، اولاد میں جائداد پر جھگڑا شروع ہوگیا اور اس پر انہوں نے ایک دوسرے پر بندوقیں تان لیں۔

عجب اتفاق دیکھیں کہ ان بزرگ کے وصال کے بعد ان کی اولاد کے

درمیاں یہی کچھ ہوا اور آپس کا تصادم آخری حد تک ہوا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ بلوچستان کے نقشبندی بزرگ کے ایک خاندان کا ہے۔ نقشبندی سلسلہ کے ایک بڑے بزرگ تھے، جن کے اخلاص وللھیت اور تقویٰ وبزرگی کی وجہ سے سندھ میں ۹۰ سال سے ان کے مریدوں کی کافی تعداد ہے، ان بزرگ کا وصال تو بیسویں صدی کے چھٹے دہائی میں ہوا، اس کے بعد ان کے فرزند اس مسند پر بیٹھے، ان کے فرزند بھی والد کے نقش قدم پر تھے، موصوف سردیوں کے موسم میں چھ ماہ شکارپور میں اپنی خانقاہ میں رہتے تھے، شکارپور سے پھر سندھ اور پنجاب کے دورہ پر روانہ ہوتے تھے، شکارپور میں ایک محلّہ کے مکانات ان کے تھے، آٹھ دس سال پہلے ان کا وصال ہوا، ان کے وصال کے بعد ان کے بیٹے اور ان کے چچا زاد بھائیوں کے درمیاں جائداد پر تصادم ہوا۔ یہ تصادم اتنا بڑھا کہ دونوں کو اپنی حفاظت کے لئے مسلح پہرے کا انتظام کرنا پڑا اور شکارپور میں رہائش پذیر ان کے صاحبزادے جو بزرگ کے جانشیں ہیں، وہ کوئٹہ میں اپنے آبائی گھر نہیں جا سکتے، ان کے چچازاد بھائی مسلح افراد کی حفاظت کے بغیر شکارپور نہیں آسکتے۔

بالآخر جائداد کا مسئلہ عدالت میں چلا گیا، جج صاحب اس خاندان کی خدمات سے پوری طرح واقف تھے، پیشی کے موقعہ پر جج صاحب نے دونوں فریقین سے کہا کہ میرے لئے تو یہ بات بڑی شرم کی بات ہے کہ آج میں اپنی کورٹ میں اتنے بڑے بزرگ کے خاندان کے افراد کو جائداد میں تنازعہ کی وجہ سے یہاں دیکھ رہا ہوں، میں دونوں فریقوں سے درخواست کروں گا کہ وہ ہماری عقیدت اور ہمارے جذباتِ محبت کو پیش نظر رکھکر باہم مصالحت کر لیں اور آئندہ پیشی پر وہ مصالحت نامہ تیار کرکے لائیں۔

جج صاحب کی یہ دردمندانہ آواز بے اثر ثابت ہوئی اور ان کا تصادم اب تک جاری ہے۔

تیسرا واقعہ صوبہ پختونخواہ کا ہے وہاں ایک بہت بڑے بزرگ تھے، جن کی تقویٰ اور وخشیت کے واقعات کتابوں میں بھی آتے ہیں۔ بیس پچیس سال پہلے ان کا وصال ہوا ہے۔ پانچ سال پہلے ان بزرگ کے بڑے فرزند نے زرعی زمین کے تنازعہ پر اپنے دو بھائیوں کو شہید کیا، حالانکہ بڑے فرزند صاحب کارخانہ دار ہیں، ارب پتی ہیں۔

اپنے جن بھائیوں کو انہوں نے شہید کیا، ان سے ہمارے مراسم تھے، ان کے معصوم چہرے دیکھکر اب بھی دل خون کے آنسو بہانے لگتا ہے۔

واقعات تو کافی ہیں۔ لیکن یہ کچھ واقعات بہت بوجھل دل کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی پیش کئے ہیں۔

ہم اللہ سے جمیع بزرگوں، جمیع مسلمانوں اور اپنے بارے میں خیر وعافیت کی دعا مانگتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ ہمیں مادیت کی طوفانی لہروں سے بچائے اور ہمارے دین وایمان کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

ذکر میں ناغہ کے منفی اثرات اور اس کے اسباب

ذکر وفکر ایسی نعمت عظمیٰ ہے کہ جس دن اس میں ناغہ یا کمی واقع ہوگی تو اس دن فرد کا ذہنی اور مزاجی اعتدال قائم اور برقرار نہ رہ سکے گا۔

سوچ میں منفی پہلو غالب ہوگا۔ افراد کے بارے میں رائے اور رویہ میں بے اعتدالی اور سختی پیدا ہوگی۔

عارضی دنیا کے مستقبل کی فکر غالب ہوگی، اللہ کی ذات پر توکل میں کمی پیدا ہوگی، دنیا کا رعب، دہشت اور لوگوں سے امیدیں زیادہ وابستہ ہوں گی، بلکہ نگاہیں لوگوں کی جیبوں کی طرف مبذول ہوں گی، معاملات میں صحتمدانہ عمل متاثر ہوگا، بلکہ معاملات کی صحیح نوعیت کو سمجھنے کی استعداد متاثر ہوگی، قوت فیصلہ اور قوت ارادی میں

کمی واقع ہوگی، آداب انسانیت اور سلیقہ انسانیت کی صلاحیت مجروح ہوگی، اشتعال کا غلبہ ہوگا، اس دن فرد کسی نہ کسی حادثہ سے دوچار ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ نیز اس دن،دل پر تاریکی چھانے لگے گی، نیک اعمال کی توفیق میں کمی ہوگی۔ اس دن اداسی، احساس تنہائی، ضد اور چڑ چڑا پن کے جذبات اندر سے ابل کر سامنے آئیں گے۔

جب ایک دو دن کے ذکر وفکر کے ناغہ کے اتنے نقصانات ہیں تو ذکر کو معمول نہ بنانے کے جو نقصانات ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دراصل روح اور دل کی زندگی ذکر ہی سے وابستہ ہے، جب انہیں ذکر کی خوراک نہیں ملتی تو ان کا اشتعال غیر معمولی طور پر بڑھ جاتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ مذکورہ نوعیت کی خرابیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ شخصیت سراپا بے برکتی سے عبارت ہوجاتی ہے۔ گویا فرد سے اصل روح نکل جاتی ہے اور جسم واعضا جامد صورت اختیار کر جاتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ذکر ہی سے عبارت ہے اور شخصیت میں ساری خیر وبرکت ذکر ہی سے وابستہ ہے۔

افراد کے حالات کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر سے محروم افراد کی گھر ولی اور کاروباری زندگی بہت ساری مشکلات، پیچیدگیوں اور الجھنوں سے دوچار ہوتی ہے، وہ ان الجھنوں پر قابو پانے کی جتنی زیادہ کوشش کرتے ہیں، ان کی الجھنیں مزید بڑھ جاتی ہیں۔ دولت حاصل ہونے کے باوجود ان کا ذہنی سکون برباد ہوجاتا ہے اور احساس میں ایسی خرابی پیدا ہوجاتی ہے کہ فرد باطنی طور پر انگاڑوں پر لیٹنے کے مترادف ہوجاتا ہے۔ احساس کی یہ خرابی دولت، مادی حسن کی دستیابی اور ظاہری طور پر بگڑے ہوئے حالات سے درست نہیں ہوسکتی، ہاں وقتی طور پر بہتری آجاتی

ہے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر احساس میں فساد سے پیدا ہوجاتا ہے، سبب یہی ہے کہ دل وروح کی بے چینی مادی چیزوں دور نہیں ہوسکتی۔ ذکر میں ناغہ کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔

یکم۔ ریا، تکبر اور دعویٰ وغیرہ کا مظاہرہ یا گلہ وغیبت وغیرہ۔

دوم۔ ذکر سے نامانوس افراد کی صحبت اور ان سے تعلقات، جس کی بنا پر ذکر کی دوری کی وجہ سے ان کے دلوں میں موجود کدورتوں کے اثرات منتقل ہوکر، طالب کے ذکر کو متاثر کردیتے ہیں۔

سوم۔ کثرت کلام یعنی غیر ضروری زیادہ گفتگو، جس سے دل اذیت محسوس کرتا ہے اور ذکر کے سلسلہ میں دل کی صلاحیت بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔

چہارم۔ قبض کی حکمت کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے، تاکہ طالب کو احساس دلایا جائے کہ ذکر کی استعداد کا حاصل ہونا، اللہ کے فضل خاص کی وجہ سے ہی ممکن ہے، اس لئے فرد کو اپنے ذکر پر ناز ہرگز نہ کرنا چاہئے، اس طرح کے قبض والے ذکر کے ناغہ کی حیثیت تربیت کی سی ہوتی ہے، مقصود طالب کو دعویٰ کی راہ پر گامزن ہونے سے بچانا ہوتا ہے۔

کاروباری مصروفیت کی وجہ سے وقت کی کمی کا عذر بھی اس کا سبب ہوسکتا ہے۔

بہرحال سبب جو بھی ہو، ذکر میں ناغہ طالب کے لئے قیامت خیز ثابت ہوتا ہے، ذکر میں ناغہ کی وجہ سے اعمال کی توفیق میں کمی آنے لگی ہے، اگر ذکر کے ناغہ کے دورانیہ میں اضافہ ہوگیا تو ذکر چھوٹ جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اور ذکر، فرد سے سلب ہونے لگتا ہے، اس طرح فرد، چند ماہ کے اندر اندر نفس پرست اور مادہ پرست معاشرہ کا حصہ ہونے لگتا ہے اور ذکر کے سلسلہ میں اس کی حساسیت ختم

ہوجاتی ہے۔ اس لئے ذکر میں ناغہ کو معمولی کوتاہی نہ سمجھا جائے، فوراً سنبھلنے کی ضرورت ہے، تاکہ ذکر کا تسلسل قائم رہ سکے۔

ذکر کے حلقہ میں شریک ہونے والے افراد کو تو اس حلقہ میں شرکت کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے۔ ایک حلقہ میں عدم شرکت کے اثرات دوچار ہفتوں تک قائم رہتے ہیں اور کیفیات زیر وزبر رہنے لگتی ہیں۔

روح کی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ ذکر وفکر کی غذا کے بغیر رہ نہیں سکتی، بلکہ وہ مریض ہوجاتی ہے اور سخت صدمہ سے دوچار ہوتی ہے، روح کو روزانہ ذکر وفکر کی بھرپور غذا چاہئے، دوسری صورت میں روح اپنی سواری یعنی جسم اور جسمانی نظام کو حادثوں سے دوچار کردیتی ہے۔ واضح ہو کہ انسانی جسم کی مثال روح کی سواری کی سی ہے، اصل شخصیت روح کی ہے۔ جسم اس کے لئے سوار کی حیثیت رکھتی ہے، اصل یعنی روح کو نظر انداز کرکے، سواری کو موٹے سے موٹا کرتے رہنے کی روش روح کے لئے شدید تشویش کا باعث ہوتی ہے۔

انسان پیٹ کو غذا دیئے بغیر کچھ ہفتوں تک زندہ رہ سکتا ہے، لیکن روح کو غذا دیئے بغیر وہ چند دن بھی صحتمند نہیں رہ سکتا۔

اس نکتہ کو سمجھنے سے ہی انسانی شخصیت کی صحتمندی کا راز پوشیدہ ہے، بھرپور ذکر وفکر کی روزمرہ خوراک کے بغیر انسانی شخصیت اندر سے کھوکھلی ہوجاتی ہے، اور چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اسے ہلاکر رکھ دیتا ہے، اس طرح جہاں روح شدید اذیت سے دوچار ہوتی ہے، وہاں اس کی سزا جسم کو بھی بھگتنی پڑتی ہے کہ معاشی حالات کی خرابی یا مزاج کے خلاف ہونے والے واقعات کے وقت اس کی مزاحمانہ قوت کمزور ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ مختلف جسمانی امراض کا شکار ہوجاتا ہے، ذہنی دباؤ، ڈپریشن اور دل کی بیماریاں وغیرہ اکثر اسی کا نتیجہ ہوتی ہیں، جب کہ روح کو ذکر وفکر کی بھرپور

غذا دینے والے اکثر اس طرح کی ساری بیماریوں سے محفوظ ہوتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ انسانی شخصیت کو نور اور حسن کی ضرورت ہے، یہ نور اور حسن دل اور روح کے ذریعہ ہی داخل ہوتا ہے، دل اور روح ذکر کے نور اور حسن کے یہ اجزاء واثرات سارے جسم میں تقسیم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، جس سے انسانی شخصیت کے سارے جذبات واحساسات کی تسکین ہونے لگتی ہے اور شخصیت خوشی، حلاوت اور اعتماد سے سرشار ہوجاتی ہے، اور یہی سب سے بڑی نعمت ہے، جو ذکر وعبادت کے علاوہ کسی اور طریقہ سے حاصل ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے ذکر وعبادت انسانی فطرت کا سب سے طاقتور داعیہ (تقاضا) ہے، اس تقاضے کو نظر انداز کرنے سے ہی انسان سارے مسائل، مصائب اور ہر طرح کے بحرانوں سے دوچار ہوتا ہے۔

ذکر سے بے پناہ حلاوت کا عطا ہونا

اللہ کے ذکر کی حلاوت ایسی چیز ہے کہ جو ایک بار اس حلاوت سے آشنا ہوگیا، اسے گویا دنیا کی ساری نعمتیں اور حلاوتیں حاصل ہوگئیں۔ اس لئے کہ جس ہستی نے یہ ساری کائنات بنائی ہے اور سارا حسن تخلیق کیا ہے، اس ہستی کے اسم ذات کے نام کے تکرار میں یہ حسن سمٹ کر آجاتا ہے، جس سے بندہ مومن کے حسن کے سارے جذبات کی تسکین ہونے لگتی ہے، اس کے بعد اسے دنیا میں کسی اور چیز کی ہوس باقی نہیں رہتی، لیکن اللہ کے ذکر کے ذریعہ اس کے انوار حسن سے فیضیاب ہونے میں چونکہ نفسی اور مادی قوتیں شدید رکاوٹ ہیں، اس لئے مبتدی طالب جب تک ذکر وفکر کے مجاہدوں کے ذریعہ متوسط طالب کی سطح تک نہیں پہنچتا، تب تک اسے ذکر کی مطلوبہ حلاوت نصیب نہیں ہوتی، بلکہ نفس کے ساتھ شدید مزاحمت کے نتیجہ میں وہ ذہنی دباؤ اور شدید وسوسوں کی زد میں آسکتا ہے، اس لئے کہ نفس چونکہ مادہ کی پیداوار ہے، اس لئے وہ مادہ پر ٹوٹ پڑتا ہے اور روح اور دل کی غذا کی راہ

میں وہ شدید حائل ہوتا ہے، اور وسوسوں، تفکرات، ذہنی دباؤ اور لاشعور میں موجود زندگی بھر کی یادوں اور واقعات کا اندر سے طوفان کھڑا کر دیتا ہے، جس سے مبتدی طالب پریشانی، گھبراہٹ اور بعض اوقات شدید بے چینی کا شکار ہوجاتا ہے اور ذکر سے فراری خیالات اس پر غالب ہونے لگتے ہیں، لیکن مبتدی طالب کو مایوس اور پریشان ہونے کی قطعا ضرورت نہیں ہے، اسے صبر، ہمت اور حوصلہ سے کام لے کر تھوڑا بہت مراقبہ کرتے رہنا چاہئے۔ مسلسل کرتے رہنے اور روحانی استاد سے رابطہ رکھنے کے نتیجہ میں اس کی ذکر ومراقبہ کی استعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا، اس کے وسوسوں میں کمی آتی جائے گی اور اندر میں موجود نفس پرستی کے بتوں سے اسے آہستہ آہستہ نجات ملتی جائے گی اور نفسی قوتوں پر بتدریج روحانی قوتیں غالب ہوتی جائیں گی، نیز اس کے ذکر کے ملکہ میں استحکام آتا جائے گا۔

ذکر کے ملکہ میں بہتری پیدا ہونے کے بعد اسے ذکر سے جو حلاوت نصیب ہوگی، یہ حلاوت اس کے لئے دنیا وآخرت میں سعادتوں کے دروازوں کے کھولنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

جب ذکر اس سطح تک پہنچیگا تو اسے جو روحانی سکون، قلبی سکون اور ذہنی سکون نصیب ہوگا، وہ بے پناہ ہوگا۔ ذکر کا یہی تکرار طالب کے لئے انسانی جوہروں سے بہرہ وری کا موجب ثابت ہوگا۔

مبتدی طالب کو یہ نکتہ سمجھنا چاہئے کہ نفس کی دنیا میں کدورتوں اور کثافتوں کا بہت بڑا ڈھیر موجود ہے، جب تک نفس کی گہرائیوں میں موجود اس گندگی کی صفائی نہیں ہوتی، تب تک نہ تو نفس میں انوار الٰہی جاگزیں ہو سکتے ہیں اور نہ ہی نفس، نفس مطمئنہ کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔ نفس مطمئنہ کی دولت بہت بڑی دولت ہے، جو کثرت ذکر کے ذریعہ نفس سے حالت جنگ میں رہنے کے نتیجہ میں ہی حاصل ہو

سکتی ہے۔

دولت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ ان احادیث میں دنیاودولت کی مطلق نفی نہیں ہے، بلکہ ایسی دولت جو آخرت کے خسارہ کی قیمت پر حاصل ہو، یا ایسی دولت جو اللہ کی عبادت، اس کے ذکر وفکر اور اللہ کی محبت سے دستبرداری کا میلان غالب ہو، نیز ایسی دولت جس میں دنیا کی محبت غالب ہو، اس کی نفی کی گئی ہے۔ ورنہ جائز ذرائع سے ضروریات زندگی کے لئے جدوجہد تو دینی فریضہ ہے، اس لئے ایک حدیث شریف میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی روزگار کی جدوجہد میں پسینہ بہتے ہوئے دیکھکر خوش ہوتا ہے۔

یہ تفصیلی موضوع ہے، جس پر یہاں مزید گفتگو کی گنجائش نہیں ہے، اس موضوع پر ہماری کتاب ''انسانی شخصیت میں نصب بت'' کتاب میں تفصیلی بحث موجود ہے۔

تعمیر شخصیت کے حوالے سے

کچھ اہم نکات

شخصیت کے توازن کا اسم ذات کے ذکر سے قائم ہونا

شخصیت کا توازن اللہ کی ہستی اور اس کے اسم ذات کے ذکر سے ہی وابستہ ہے، اس لئے کہ ساری اشیائے کائنات اس کی تسبیح وتعریف میں مصروف ہیں۔ **تُسَبِّحُ لَـهُ السَّـمَـاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ.** (اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور ان میں موجود ساری چیزیں) جب ساری کائنات کا ہدف اس کا ذکر ہے تو انسان جب اس تسبیح وذکر سے اعراض کی روش اختیار کرے گا تو وہ کائنات میں احساس تنہائی واحساس بے گانگی کا شکار ہوجائے گا اور نفس اور شیطان کی بے رحم قوتوں کا شکار ہوکر، اس کی شخصیت میں تلاطم برپا ہوجائے گا۔

یہ تلاطم اسے دولت کے بت خانے پر سجدہ ریزی پر مجبور کرے گا اور دولت کی پرستاری، اس سے انسانیت کے سارے جوہروں کو سلب کرنے کا ذریعہ بنے گی اور وہ سکون کی نعمت کے حصول کے لئے مارا مارا پھرتا رہے گا اور دولت کے سارے خزانے خرچ کرنے سے بھی اسے سکون کی نعمت نہ مل سکے گی۔ اس نکتہ کو سمجھنے سے ہی شخصیت کے سارے داخلی مسائل کا حل وابستہ ہے، ورنہ اس زندگی کے ساتھ ساتھ ابدی زندگی کا اضطراب اس کا مقدر ہے۔ کاش انسان سمجھ جائے۔

جدید انسان کا

اضطراب کا سراپا مجسمہ ہوجانا

جس دن عبادت وذکر وفکر کے ذریعہ معنوی حسن سے بہرہ وری میں کمی واقع

ہوگی، اس دن طالب کا مادی حسن کے اثرات سے بچنا مشکل ہوگا۔ ذکر وفکر کی خوراک کی کمی اس کے دل، اس کی نظروں اور اس کی عقل میں مادی حسن کی لہریں پیدا کرنے کا موجب بنے گی اور وہ ذکر وفکر کے ذریعہ حاصل ہونے والے اجزائے حسن کی کمی کو مادی حسن کے مشاہدہ کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کرے گا، اس طریقہ سے اس کے اس داعیہ کی تشفی تو ممکن نہیں ہوگی، البتہ اس کا دل زیر وزبر ہوجائے گا اور وہ مفاسد کا شکار ہوگا، جب تک دل کو اس کی مطلوبہ خوراک فراہم نہ کرے گا، اس کی حالت میں بہتری اور ٹھہراؤ پیدا نہ ہوگا۔

جدید دور کا مادی انسان اس حقیقت کو سمجھنے میں ناکامی کی وجہ سے ہی سراپا حیرت اور اضطراب کا مجسمہ بن گیا ہے۔

باطن میں موجود خزانوں سے

ناآشنائی اور اس کے اثرات

انسان کا باطن بے شمار خزانوں سے بھرپور ہے، محبت ومعرفت کے خزانے، خودشناسی اور باطن میں ڈوبنے کی وسعتیں، محبوب حقیقی سے میلاپ کی آرزوئیں وتمنائیں، مادی دنیا سے بلند ہوکر، روح وروحانیت کی لطیف ترین دنیا میں سیروسفر کی صلاحیتیں اور فرشتوں سے بھی افضل ہونے کی استعداد، لیکن انسان کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہ شعور وظاہری علم کی سطح سے بلند ہوکر، باطن کی وسیع تر دنیا میں داخل ہوکر، روحانی قوتوں کو اجاگر کرنے کے لئے تیار ہی نہیں۔ باطن میں موجود لامحدود خزانوں کی مثال برف کے پہاڑ کی ان تہوں سے دی جاسکتی ہے، جن تہوں کو عبور کرکے، اس کی آخری تہہ تک پہنچ کر، وہاں موجود خزانوں تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ نفس پرستی کی قوتوں کو عبور کرکے، ہی باطن میں موجود ان سارے خزانوں تک پہنچا جا سکتا ہے، اس کے لئے اہل اللہ کے سامنے خودسپردگی وپامالی اور ذکر وفکر کے مجاہدے

ضروری ہیں، اس کے بغیر ان خزانوں کی یافت دشوار تر ہے۔

جب تک فرد روحانیت کی ان لطافتوں سے محروم ہے، اس وقت تک وہ مادہ کی بے رحم قوتوں کی گرفتاری اور ان کی غلامی سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

یہ ایسا اہم نکتہ ہے، جسے بدقسمتی سے اس دور کا انسان اپنی فطری صلاحیتوں کے ضیاع کی وجہ سے اس کے فہم سے قاصر ہے۔

انسان کی موجودہ ساری پریشانیوں اور اضطراب خیزیوں کا بنیادی سبب ہی یہی ہے۔

صوفی، عشق کا پورا جام نوش کئے بغیر کامل صوفی نہیں بن سکتا

ایک بڑے صوفی شاعر کا شعر ہے کہ صوفی، کامل صوفی، نفس کی ریغمالی سے مکمل طور پر آزاد صوفی اور پاکباز صوفی اس وقت تک نہیں بن سکتا، جب تک عشق کا جام پوری طرح نوش نہیں کرتا۔ مزید کہتا ہے کہ خام کو پختہ بننے کے لئے بہت طویل سفر کرنا پڑتا ہے۔ شعر یہ ہے۔

صوفی نہ شود صافی
تا در نہ کشد جامے
بسیار سفر تا پختہ شود خامے

موجودہ دور میں تصوف کے نام پر جگہ جگہ جو دکانیں سجائی گئی ہیں، یہ اصل میں ہم جیسے خام صوفیوں کی طرف سے دنیا بنانے کی آرزوؤں کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ حقیقی صوفی تو جان توڑ مجاہدوں کے ذریعہ نفسی قوتوں کو شکست دینے اور طویل عرصہ تک ان قوتوں کو آتش عشق میں جلانے کے بعد ہی اس منصب پر فائز کر دیا جاتا ہے، جب ایسا ہوتا ہے تو مالدارانہ ذہنیت ونفسیات قطع ہوجاتی ہے اور صوفی لینے کی

بجائے دیتا ہے اور مال بنانے سے کراہت، اس کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے، اس لئے کہ ذکر وفکر کے جان توڑ مجاہدے اس کے باطن کو پاک وصاف اور مہذب بنا چکے ہوتے ہیں۔ سارے بزرگوں کا اتفاق ہے کہ ذکر وفکر کے جان توڑ مجاہدوں کے بغیر صوفی کامل صوفی بن ہی نہیں سکتا۔

اہل اللہ کے تجربات ومشاہدات سے انحراف کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے، جس کا اس وقت ہم مشاہدہ کررہے ہیں۔

خود پسندی سے حق تک رسائی ممکن نہیں

خود پسندی، خود ثنائی وخود نمائی کے ساتھ حق وحقائق تک رسائی نہیں ہوتی، اگرچہ ذہنی وعلمی صلاحیت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ چاہے فرد الفاظ وعلوم کا سمندر ہی ہو، لیکن اس صورت میں حق اس کے دل میں سما نہیں سکتا۔ حق تک رسائی کے لئے ان بتوں سے دستبرداری ناگزیر ہے۔

دوسری صورت میں فرد دوئی ودورنگی کا شکار رہے گا، علم وذہانت اس میں اخلاص وللھیت وبےنفسی پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوگی۔

وقت کے ایک حصہ کی قربانی سے عظیم نعمت کا حاصل ہونا

فرد اپنی زندگی کا جتنا حصہ درسی علوم اور معاشی وفنی علوم میں صرف کرتا ہے، اگر اس کا ایک ہی حصہ اخلاص اور حقیقی انسانیت اور انسان سازی کے علوم کے لئے صرف کرے تو وہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ انسانیت کے لئے بھی باعث وخیر وبرکت بن سکتا ہے۔

اپنی ذات سے دستبردار ہونا یا ذاتی مفادات ومیلانات سے بلند ہونا، سب

سے مشکل ترین کام ہے، اس کے بغیر فرد کے لئے سعادت دارین کی راہیں کھل سکیں، ممکن نہیں۔

راہ سلوک کا دو دھاڑی تلوار ہونا

سلوک کو دودھاڑی تلوار کہا جا سکتا ہے کہ یہ نفسی قوتوں کو مفلوج بھی کر سکتی ہے، اگر پورے اصولوں کے ساتھ چلا جائے، لیکن اگر راہ سلوک کی جزوی تکمیل کے باوجود اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی رہی تو یہ تلوار فرد کی شخصیت کے لئے پامالی کا پیشہ خیمہ بھی بن سکتی ہے۔ یعنی بزرگی کے ذریعہ فرد کو زیادہ سے زیادہ مال بنانے اور مالدار سے مالدار تر بننے کی راہ پر بھی گامزن کر سکتی ہے۔ اس طرح فرد بظاہر تو بزرگ بنتا جاتا ہے اور لوگوں کو ان کی طلب کی بنیاد پر ان سے فیض بھی ملتا رہتا ہے، لیکن عملاً وہ بزرگ، دنیا دار انسان کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور خودنمائی وخود پسندی کی راہ پر گامزن ہونے لگتا ہے اور بڑے بڑے القاب سے موسوم ہونے لگتا ہے۔

بہت زیادہ خطرہ کی بات ہے اور ڈرتے رہنے اور بزرگوں کے متعین کردہ اصولوں کے ساتھ چلتے رہنے کی ضرورت ہے۔

مادی خوشحالی وراحت کے نام پر باطن کو تاریک بنانے کی کاوشیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیاوی زندگی کی خوبصورتی اور رونق میں جتنا زیادہ اضافہ ہوتا جارہا ہے، اور نئی نئی حسین چیزیں سامنے آرہی ہیں، اسی مناسبت سے باطنی زندگی ویران سے ویران تر ہوتی جارہی ہے، روڈوں اور راستوں پر نئی نئی خوبصورت اور تیز رفتار گاڑیوں کے منظر سے ابھی نظر اٹھتی ہی نہیں کہ بڑے بڑے خوبصورت بنگلے فرد کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے لگتے ہیں، فرد ابھی اس منظرِ رونق سے

فارغ ہی نہیں ہوتا تو حسین لباسوں میں ملبوس ماڈرن انسان اس کی کشش کا موجب بنتے ہیں۔

جدید انسان نے دنیا اور مادی زندگی کو خوبصورت سے خوبصورت بنانے پر اتنی محنت کی ہے کہ یہ ساری دنیا ایک خوبصورت بت خانہ کی صورت اختیار کر چکی ہے اور جدید انسان کو اس بت خانہ پر سجدہ ریزی سے فرصت ہی نہیں ملتی، لیکن اسے اس کی جو قیمت دینی پڑ رہی ہے، وہ باطنی زندگی کی گھٹا ٹوپ اندھیری ہے، حقیقی خوشی اور سکون سے محرومی ہے، بڑھتا ہوا ذہنی دباؤ ہے، تفکرات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، روح کا اضطراب اور اس کی شدید اذیت ہے۔

مادی دنیا کی زندگی کی اس خوبصورتی کی مثال اس فرد کی سی ہے، جسے بت بڑے بنگلہ میں دنیا بھر کی لذتوں وآسائشوں کا سامان فراہم کر دیا گیا ہو اور رونق کی ہر چیز اسے میسر ہو، لیکن ساتھ ساتھ اس کی آرام گاہ میں ایک سانپ بھی چھوڑ دیا گیا ہو، جو ہر وقت پھنکار رہا ہو، کیا اس طرح کے فرد کو خوش نصیب، قابل رشک اور کامیاب انسان کہا جائے گا یا اس کی بدنصیبی کا رونا رویا جائے گا۔

قرآن نے چودہ سو سال پہلے جدید انسان کے ان حالات کی جو نشاندہی فرمائی تھی، اس سے بہتر نشاندہی ہو نہیں سکتی۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِراً مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ . (یہ دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں آخرت کی زندگی سے غافل ہیں)۔

دوسری جگہ ہے **فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا.** (آپ ان کے اولاد ومال پر تعجب نہ کریں، اللہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کے ذریعہ انہیں دنیا میں ہی عذاب دیا جائے)۔

دنیا میں عذاب یہی ہے کہ پیسے کے ہیر پھیر اور دنیا کی مزید حرص میں مبتلا

کر کے، اسے بے چین کر دیا جاتا ہے، دل، دولت میں ہی اٹکا رہتا ہے، ذہن کی ساری سوچ اور سارے خیالات کا محور دولت بن جاتی ہے، کاروبار میں معمولی نقصان کے تصور سے ہی نیند اڑ جاتی ہے، سکون سلب کر دیا جاتا ہے، برکت اٹھالی جاتی ہے، پاکیزہ انسانی جذبات واحساسات سے محرومی ہوجاتی ہے۔ انسانوں کو دولت کمانے کی مشین تصور کر کے، انہیں اپنی دولت میں اضافہ کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، اس کے لئے کم اجرت اور زیادہ وقت لے کر سنگینی وقساوت قلبی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، نیز دولتمندوں کو طرح طرح کے جسمانی وروحانی امراض میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح کی ساری صورتیں عذاب میں ہی شمار ہوتی ہیں، آخرت کا عذاب تر شدید تر ہے۔

زخمی شیر، گدھے اور انسان کی مثال

مادی دنیا پر فریفتہ انسان کی حالت اس گدھے کی سی ہے، جو بھیڑیا کے اکسانے پر باغ میں چَرنے کے لئے آیا تھا اور وہ زخمی شیر کے حملہ کا شکار ہوا۔

یہ تمثیلی قصہ مولانا رومی نے اپنی مثنوی میں بیان کیا ہے، لکھتے ہیں، ایک خشک پہاڑی علاقہ میں ایک خاندان رہتا تھا، ان کے ہاں گدھا بھی تھا، پہاڑی علاقہ سے متصل زیرین حصہ میں بڑا جنگل واقع تھا، وہاں ایک شیر بھی رہتا تھا، شیر، شکاری کی بندوق سے زخمی ہوگیا تھا اور شکار کرنے کے قابل نہیں تھا، شیر نے بھیڑیے سے کہا کہ میرے لئے کوئی شکار لاؤ، بھیڑیا، پہاڑ پر گیا تو اس نے گدھے کو دیکھا اور اسے کہا کہ آہا، بھوک سے تمہاری تو ہڈیاں پسلیاں نکلی ہوئی ہیں۔ تم بڑے محروم گدھے ہو کہ تمہارے قریب ہی نیچے بہت زیادہ سرسبز علاقہ موجود ہے، بہت بڑا باغ ہے، جس میں ہر طرح کا سبزہ ہے اور صاف اور ٹھنڈے پانی کی نہر بہر رہی ہے، تم اللہ کی ان نعمتوں سے محروم ہو، چلو میرے ساتھ اور وہاں جا کر رہو، قدرت کی نعمتوں سے بڑی

خوشگوار زندگی گذارو گے، گدھے نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میرا مالک اپنی بساط کے مطابق مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ میں اس پر خوش اور مطمئن ہوں، بھیڑیے نے کہا کہ تم نے اگر ایک بار وہاں کا جنت نما منظر دیکھ لیا ہوتا تو تمہیں یہاں ایک لمحہ کے لئے بھی قرار نصیب نہ ہوتا، گدھا بالآخر بھیڑیے کی باتوں میں آ کر اس کے ہمراہ ہوگیا، جب وہ پہاڑ سے نیچے اترا تو شیر جھاڑی میں چھپا ہوا تھا، اس نے گدھے کو دیکھکر اپنی عادت سے مجبور ہوکر چیخ ماری اور حملہ کے لئے چھلانگ مارنے کی کوشش کی، لیکن چونکہ وہ زخمی تھا، اس لئے چھلانگ نہیں مار سکا، اس طرح گدھا بھاگ گیا۔

کچھ دنوں کے بعد شیر نے بھوک سے مجبور ہو کر، بھیڑیے سے کہا کہ اب پھر گھیر گھار کر اس گدھے کو لے آؤ، بھیڑیا گدھے کے پاس آیا، گدھے نے دور سے دیکھتے ہی اس کو لعنت وملامت کی اور کہا کہ ذلیل کمینہ بھیڑیے، میرے قریب ہرگز نہ آنا، تم نے تو مجھے شیر کا لقمہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ بھیڑیا اس کی باتیں سنتا رہا، جب گدھے کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو بھیڑیے نے کہا، میری جان سے بھی زیادہ پیارے گدھے، پتہ نہیں، تم کیا کہتے ہو، نیچے تو سرسبز باغ اور نہر ہے، وہاں شیر کہاں سے آیا، معلوم ہوتا ہے کہ تم نے یہ سب خواب دیکھا ہے، خواب میں ہی تم نے شیر کو حملہ آور ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم جس طرح چاہو، میں تمہیں یقین دلانے کے لئے تیار ہوں کہ وہ ایسا جنت نما منظر ہے کہ ایک بار دیکھنے کے بعد تم محسوس کروگے کہ تم نے یہاں خشک پہاڑی علاقہ میں اپنی زندگی ضایع کردی، گدھے نے ابتدا میں تو اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا، لیکن اس کی طرف سے قسم کھانے کے بعد اس نے بھیڑیے کی بات کو صحیح سمجھا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب وہ آرام سے اس جگہ آیا، جہاں شیر چھپا ہوا تھا تو شیر نے اس پر حملہ کر کے اسے گرا دیا اور اس کا گوشت کھالیا، اس نے گردے اور آنتیں وغیرہ بھیڑیے کے حوالے کیں، بھیڑیے نے کہا،

او احمق گدھے، جب تمہیں ایک بار جنگل میں شیر کا تجربہ ہو چکا تھا تو تم نے میرے کہنے پر دوبارہ یہاں آ کر اپنے آپ کو موت کا شکار کیوں بنایا؟

مولانا نے اس تمثیل سے واضح کیا ہے کہ انسان کو شیطان اور نفسی قوتوں کے حملوں کے مسلسل تلخ تجربے ہوتے رہتے ہیں، ان تجربوں کی وجہ سے وہ شدید ابتلا وآزمائشوں کا شکار ہوتا رہتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ شیطان اور نفسی قوتوں کے چنگل سے نکلنے کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوتا اور مسلسل ان کے جال میں پھنس کر، اپنی آخرت کی دائمی زندگی کو خراب کرنے کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ اور یہ بے حس انسان ان تجربات سے سیکھنے سمجھنے اور سنبھلنے کی کوشش نہیں کرتا، اس طرح ایک دن وہ موت کا شکار ہو کر جہنم کا ایندھن بنے گا۔

بے بقا زندگی اور انقلابات زمانہ۔ سنبھلنے کی ضرورت

جدید دور میں مذہبی اعتبار سے ہر حساس فرد کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دولت ودنیا اور مادی زندگی کو کتنی اہمیت دینی چاہئے، ایسے افراد بڑے خوش بخت ہیں کہ ان کے ذہن میں یہ سوال کروٹ لینے لگتا ہے۔ ورنہ عام طور پر جو فضا غالب ہے، وہ تو ایسی فضا ہے کہ دل اور ذہن میں ہمہ وقت دنیا اور مادی تفکرات ہی چھائے رہتے ہیں۔

یہ دراصل سب نتیجہ ہے، مادہ پرستی کی ہمہ گیر عمومی فضا کا، جس نے فردوافراد سے قبر، حشر اور دائمی زندگی کے احساسات کو مضمحل کر دیا ہے۔

مادی زندگی کو کتنی اہمیت دینی چاہئے اور اس کے لئے کتنا وقت نکالنا چاہئے؟ میری نظر میں اس کے لئے زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے، آٹھ گھنٹے میں جو بھی روزی میسر ہو، اس پر فرد کو صبر وشکر سے کام لینا چاہئے۔ بند مومن کو ہر وقت آخرت کی فکر دامنگیر ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اصل زندگی اور ابدی زندگی وہی ہے، حضور ﷺ نے دنیاوی اور اخروی زندگی کو سمندر سے تشبیہ دی ہے کہ سمندر میں انگلی ڈالی جائے، انگلی پر جو پانی آئے، وہ دنیاوی زندگی ہے، سمندر سارے کا سارا یہ آخرت کی زندگی ہے۔

اس وقت دنیا کی رونق، اس کی محویت، اس کی بے پناہ مصروفیات نے ہمیں آخرت کی زندگی سے آخری حد تک غافل کر دیا ہے، ہمارا سارا وقت اور ساری فکری وعملی توانائیاں دنیا کی عارضی زندگی کو بہتر بنانے میں صرف ہو رہی ہیں۔ جو سب سے

بڑی نادانی کی بات ہے، اس کے نتیجہ میں آخرت میں پچھتاوے کے طور پر خون کے آنسو بہانے پڑیں گے۔

ضرورت ہے کہ وہ اہل اللہ جنہیں دنیاوی زندگی کی حقیقت کا ادراک حاصل ہے، جو صبر، شکر سادگی اور قناعت سے زندگی گذار رہے ہیں۔ اور قناعت کی اس زندگی میں انہیں وہ حلاوت حاصل ہے کہ ایسی حلاوت ساری دنیا کی دولت خرچ کر کے بھی حاصل نہیں ہو سکتی، ہم ان کی صحبت اختیار کریں، تاکہ حلاوت کی زندگی کے یہ اجزاء ان کی صحبت کی برکت سے ہمارے دل میں بھی منتقل ہو سکیں۔

دنیا کی لذت کا یہ حال ہے کہ ایک دن پہلے ہم نے جو غذا کھائی ہے، اس غذا کی لذت کا احساس تک نہیں ہوتا، ایسی بے حلاوت زندگی، جس کی لذت کا دورانیہ چند لمحوں سے زیادہ نہ ہو، اس پر فریفتہ ہونا اور اس کی خاطر آخرت کی دائمی زندگی کو قربان کرنا، یہ اغوائے شیطانی اور اغوائے نفسانی ہے۔ سنبھلنے کی ضرورت ہے، ورنہ موت تو یقینی بات ہے، وہ آج نہیں تو کل آ کر رہے گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایک لمحہ کا حساب ہوگا۔

قرآن میں ہے کہ تم نے جو گناہ کئے ہیں، وہ تم تو بھول گئے ہو، لیکن ہمیں تمہارے وہ گناہ یاد ہیں، ہمارے سارے گناہوں کا محفوظ ہونا، اعضا وجوارح کا ان گناہوں کا پیش کرنا، کراما کاتبین کی طرف سے دفتر نامہ پیش کرنا، دھرتی کا سارے اعمال کا سامنے لاکر رکھنا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو ہمارے انتباہ اور ہمیں جھنجھوڑنے کے لئے کافی ہیں۔

دنیا کی بے بقا زندگی اور انقلابات زمانہ کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے: جو حکایات رومی سے ماخوذ ہے۔

"بنی اسرائیل کے ایک نوجوان عابد کے پاس حضرت خضر علیہ السلام تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ بات اس وقت کے بادشاہ نے سنی تو اس نے نوجوان عابد کو بلایا اور پوچھا۔

کہ یہ بات سچ ہے کہ تمہارے پاس حضرت خضر علیہ السلام آیا کرتے ہیں؟

اس نے جواب دیا۔

کہ ہاں

بادشاہ نے کہا۔

اب جب وہ آئیں تو انہیں میرے پاس لیکر آنا، اگر نہ لاؤ گے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔

چنانچہ ایک دن حضرت خضر علیہ السلام اس عابد کے پاس تشریف لائے تو عابد نے ان سے سارا واقعہ عرض کر دیا۔

آپ نے فرمایا۔

چلو، اس بادشاہ کے پاس چلتے ہیں، چنانچہ آپ اس بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا۔

کیا آپ ہی خضر ہیں؟

فرمایا۔

ہاں!

بادشاہ نے کہا، تو ہمیں کوئی بڑی عجیب بات سنائیے۔

فرمایا۔

میں نے دنیا کی بڑی بڑی عجیب باتیں دیکھی ہیں، مگر ان میں سے ایک سناتا ہوں، لو سنو!

میں ایک مرتبہ ایک بہت بڑے خوبصورت اور آباد شہر سے گزرا، میں نے اس شہر کے ایک باشندہ سے پوچھا۔ یہ شہر کب سے بنا ہے؟ تو اس نے کہا۔

یہ شہر بہت پرانا شہر ہے۔ اس کی ابتداء کا نہ مجھے علم ہے اور نہ ہمارے آباؤ اجداد کو۔ خدا جانے کب سے یہ شہر یونہی آباد چلا آرہا ہے۔ پھر میں پانچ سو سال کے بعد اس جگہ سے گذرا تو وہاں شہر کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ایک جنگل تھا اور وہاں ایک آدمی لکڑیاں چن رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، یہ شہر کب سے برباد ہوگیا ہے!

وہ مجھے دیکھ کر ہنسا اور کہا۔

یہاں شہر تھا ہی کب؟ یہ جگہ تو مدتوں سے چلی آرہی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے بھی یہاں جنگل ہی دیکھا ہے۔ پھر میں پانچ سو سال کے بعد وہاں سے گزرا تو وہاں ایک عظیم الشان دریا بہہ رہا تھا اور کنارے پر چند شکاری بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ یہ جنگل، دریا کب سے بن گیا ہے؟ تو وہ لوگ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔

آپ جیسا آدمی ایسا سوال کرے؟ یہاں تو ہمیشہ ہی سے دریا بہتا چلا آرہا ہے، میں نے پوچھا کیا اس سے پہلے یہ جگہ جنگل نہ تھی؟ وہ کہنے لگے، ہرگز نہیں، نہ ہم نے دیکھی اور نہ ہی اپنے آباؤ اجداد سے سنی، پھر میں پانچ سو سال کے بعد وہاں سے گذرا تو وہ جگہ ایک بہت بڑا چٹیل میدان دیکھا۔ جہاں ایک آدمی کو پھرتے

دیکھا، میں نے اس سے پوچھا۔ یہ جگہ خشک کب سے ہوگئی۔ وہ بولا، یہ جگہ تو ہمیشہ سے یونہی چلی آرہی ہے، میں نے پوچھا۔ یہاں کبھی دریا نہیں بہتا تھا؟ اس نے کہا۔ ایسا نہ کبھی دیکھا، نہ اپنے آباؤ اجداد سے سنا، پھر میں پانچ سو سال کے بعد وہاں سے گذرا تو وہاں ایک عظیم الشان شہر آباد دیکھا۔ جو پہلے شہر سے بھی زیادہ خوبصورت اور آباد تھا۔ میں نے ایک باشندہ سے پوچھا، یہ شہر کب سے ہے؟ وہ بولا۔ یہ شہر بڑا پرانا ہے۔ اس کی ابتداء کا نہ ہمیں علم ہے، نہ ہمارے آباؤ اجداد کو۔'' (حکایات رومی وحکایات سعدی صفحہ ۷۹)

داعی وصوفی کا

اللہ کی نصرت کے قانون میں داخل ہونا

داعی وصوفی، اللہ کی مدد ونصرت کے قانون میں اس وقت داخل ہوتا ہے، جب وہ لوگوں سے اپنی امیدیں منقطع کرکے، محض اللہ سے اپنی ساری توقعات وابستہ کر چکا ہو، یہ مقام ایسا ہے، جس پر رسائی سے پہلے داعی وصوفی کو مسلسل ابتلا وآزمائش اور صبر وشکر کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، اس ابتلا وآزمائش میں استقامت کے لئے اسے اللہ کے دوست کی مستقل صحبت اختیار کرنی پڑتی ہے اور مجاہدوں سے بھی کام لینا پڑتا ہے، اس سے اسے استقامت کی سعادت عطا ہوتی ہے۔ اس دوراں طالب کے لئے نکلنے کے سارے راستے اور مادی ذرائع مسدود کردیئے جاتے ہیں، تاکہ دوسروں کی کارسازی پر اس کا یقین متزلزل ہوکر، محض محبوب حقیقی کے کارساز ہونے کی اس کی نفسیات پختہ ہوجائے اور اس کا یقین مستحکم ہوجائے۔

ان مراحل سے گذرنے کے بعد ہی داعی وصوفی کے لئے فتوحات کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، لیکن اس وقت داعی وصوفی کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ دنیا کے حوالے سے ساری آرزوؤں سے خالی ہوچکا ہوتا ہے، فقر وفقر کی زندگی اس کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے اور وہ محبوبِ حقیقی سے فقر کی اس زندگی پر قائم اور مستحکم رہنے کا دعا گو رہتا ہے اور اس کے دعوتی، تربیتی اور اصلاحی نوعیت کے سارے کاموں میں تاثیر پذیری اور برکت اس کے اس فقر پر مشتمل کردار سے ہی ہوتی ہے۔

یہ وہ نکتہ ہے، جو اس دور میں دعوت وتزکیہ کے کام کے حوالے سے نظر انداز

ہوا ہے اور وسائل اور مالی معاونت کے حصول کی دوڑ شروع ہوئی ہے، معیار زندگی کی بلندی کی ایک نہ ختم ہونے والی رَو ہے، اس کی وجہ سے بظاہر تو داعی وصوفی کو شہرت بھی حاصل ہے اور عقیدتمندوں کی فوج ظفر موج بھی موجود ہے، لیکن ان کے تربیت کے کام میں خیر وبرکت کا عمل متاثر ہے اور ان سے وابستہ افراد کے باطن سے حب جاہ وحب مال جیسے جذبات کی پامالی کی صورت مشکل ہوتی ہے۔

سبب وہی ہے کہ جب دل پر مادی وسائل کے سایے غالب ہوتے ہیں تو اس سے باطنی تربیت کی فیض رسائی کا عمل متاثر ہوتا ہے، عقیدتمندوں کا ہجوم ہونے کے باوجود یہ عقیدتمند عام طور پر تزکیہ کے دشوار گزار مراحل سے گزرنے میں ناکام ہوتے ہیں، داعی وصوفی کے دل پر مادی وسائل کے سایوں کا عکس ان سے وابستہ افراد پر پڑے بغیر نہیں رہتا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دور میں حقیقی داعی وحقیقی صوفی اور خام داعی وخام صوفی کے درمیان بظاہر امتیاز کرنا دشوار ہے۔ لیکن یہ دشواری اس وقت تک ہے، جب تک سلف کے تصوف کے متعین کردہ اصولوں سے ناآشنائی ہے۔ ان کے اصولوں سے آشنائی کے بعد یہ دشواری باقی نہیں رہتی، اللہ کی حقیقی نصرت کا قانون سب سے بے نیاز ہوکر، محض اللہ کی ذات سے ساری توقعات وابستہ کرنے اور دنیا کے اپنے حصہ سے دستبرداری سے ہی وابستہ ہے۔ سلف کی زندگیاں اس بات کا عملی نمونہ ہیں کہ تہی دستی کی حالت میں انہوں نے ویرانے کو اپنا مرکز بنایا، لوگوں کا رجوع بھی ہوا اور ان کی زندگیوں میں حقیقی تبدیلی کا عمل بھی شروع ہوگیا۔ اگر انہیں زیادہ افراد نہ بھی ملے، لیکن اصلاح کے جو بھی شائق ملے، انہوں نے ان کی اخلاقی وروحانی طور پر مستحکم بنیادوں پر تربیت کی، اور تزکیہ کے ذریعہ انہیں حب جاہ وحب مال جیسے رزائل سے نجات دلانے میں کامیابی حاصل کی۔

یہ فقر کے مزاج کے رسوخ ہی کا نتیجہ تھا، آج اگر ایسا نہیں ہورہا ہے، داعی وصوفی اور ان سے وابستہ افراد میں دنیا داری کے مظاہر عام ہیں، سیرت وکردار میں پاکیزگی کے نمونے مفقود ہیں تو اس کا سبب یہی ہے کہ اللہ کے کامل دوستوں کی طویل عرصہ کی صحبت نصیب نہیں رہی اور نفس کو پامال کرنے کے لئے مجاہدوں کا فقدان ہے۔

حقیقی داعی وصوفی کا اصل ہتھیار دنیا سے استغنا اور فقر ہوتا ہے، دنیا سے بے نیازی وفقر کی قیمت پر ہی وہ اللہ کی نصرت کے خاص قانون میں داخل ہوتا ہے، جو داعی وصوفی دولتِ فقر سے تہی دست ہوتا ہے، اس پر مادی دنیا کے دروازے کھول

دیئے جاتے ہیں، شہرت بھی حاصل ہوتی ہے، لیکن یہ ساری چیزیں عام طور پر اس کے لئے سخت ابتلاوآزمائش ثابت ہوتی ہیں۔

روح اور مادی زندگی کے درمیاں جاری کشمکش اور بچاؤ کی صورت

روح نہایت لطیف بلکہ لطیف ترین چیز ہے، اس کا مادی نفس کے ساتھ اشتراک بہت بڑی آزمائش ہے، معمولی آزمائش نہیں، اس آزمائش میں کامیابی اور روح کی لطافت کو قائم رکھنے اور اسے نفس اور مادی کثافتوں سے بچانے کے لئے اعلیٰ درجہ کی دانش، حکمت، حوصلہ اور ہمت سے نفس سے معرکہ آرائی کی ضرورت ہے، دوسری صورت میں روح اگر نفس اور مادی کثافتوں سے لت پت ہوگیا تو اس دنیا کی مختصر زندگی کے علاوہ دائمی زندگی میں روح سمیت مادی جسم کا سکون برباد ہوگا اور دونوں عبرتناک سزا سے دوچار ہوں گے، مسئلہ معمولی نوعیت کا نہیں، انتہائی سنگین نوعیت کا ہے، انسان کی ابدی زندگی خطرہ سے دوچار ہے، انتہائی سنجیدگی کی ضرورت ہے، زندگی کو کھیل تماشا سمجھکر، وقت کو فنون اور حصول دولت کی جدوجہد میں صرف کرنا سب سے بڑی نادانی کی بات ہے۔

اس نکتہ کو سمجھنا ازحد ضروری ہے کہ روح، نفس اور مادی دنیا کے تقاضے ایک دوسرے سے جداگانہ ہی نہیں، بلکہ ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔

روحانی اور مادی زندگی میں سخت کشمکش کا سلسلہ جاری رہتا ہے، مال ودولت کے حصول کی زیادہ مصروفیات اس کشمکش میں مزید اضافہ کردیتی ہیں۔ روح اسے عالم بالا کی طرف کھینچ رہی ہوتی ہے، جب کہ دنیا کی الجھنیں اس کے لئے ملکوتی سفر کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتی ہیں۔ روح کے ملکوتی سفر کو جاری رکھنے کے لئے دنیا کے کم سے کم حصہ پر راضی رہ کر، وقت کا قابل ذکر حصہ ذکر وفکر، عبادت اور نیکوکاری میں صرف کرنا ناگزیر ہے، اسی سے فرد کی نجات وابستہ ہے، روح کے اس سفر کو جاری رکھنے کے سلسلہ میں اللہ والوں کی صحبت سب سے مؤثر وسیلہ ہے۔ ان کی صحبتِ مسلسل سے ہی نفس امارہ کو شکست دی جاسکتی ہے، اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے دوستوں کی مستقل صحبت کی سعادت عطا فرمائے۔ (آمین)

حرف آخر

کتاب میں جدید اسلامی فکر کے حاملین، بعض دانشوروں، عمار یاسر صاحب، مولانا زاہد الراشدی صاحب اور اپنے جیسے صوفیائے خام پر جو تنقید کی گئی ہے، وہ ایک اعتبار سے زیادتی نظر آتی ہے، اس لئے کہ عالمی سرمایہ دار، جس کے پاس سونے وچاندی کے ذخائراور ڈھیر موجود ہیں، جو اس وقت بالواسطہ طور پر پوری دنیا پر حکمران ہے، اس کے بیشتر وسائل اور ساری قوت اس بات پر صرف ہورہی ہے کہ عالم اسلام سے اسلامی تہذیب، اسلامی عقائد اور شعائر اسلام کو مٹایا جائے اور انسان خالص مادی نوعیت کی تخلیق ہے، اسے دنیا میں عیش وعشرت کرکے بالآخر فنا ہوجاناہے، یہی انسان کی کل زندگی ہے، اس تصور کو عالم اسلام اور مسلمانوں میں فروغ دیناہے۔ اس مقصد کی خاطر عالمی سرمایہ دار اربہا ڈالر خرچ کررہا ہے۔ حکمرانوں پر دباؤ ڈال کر، وہ ہمارے تعلیمی نظام کو مادہ پرستی پر استوار کر چکا ہے، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ افراد کو اسلامی شعائر کے خلاف ذہن بنانے کے لئے وہ انہیں سالانہ اربہا روپے دے رہا ہے۔ این جی اوز اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو سیکولرزم اور آزادی کے فروغ کے لئے وہ ان پر دولت نچھاور کررہا ہے۔

ان حالات میں اس دور میں مسلمان نسلوں کا صحیح اسلامی اعتقادات پر قائم رہنا اور اسلام کو قابل عمل دین سمجھنا، بجائے خود ایمان کی کم سے کم علامت ہے۔ نوجوان نسل میں یہ علامت بھی تیزی سے رخصت ہوتی جارہی ہے،لادینیت کا طوفان تیزی سے بڑھتا جارہا ہے۔ اچھے خاصے ذہین اور سمجھدار افراد مادیت کی عمومی مسموم فضا کے زیر اثر اسلام سے دور سے دور تر ہوتے جارہے ہیں۔ اصلاح نفس اور تزکیہ کی فکر تو مفقود سے مفقود تر ہوتی جارہی ہے۔

ان حالات میں جو دانشور، جو صوفیا اور جو علماء کرام دین کی حمایت ووکالت اور کسی بھی لحاظ سے اس کی خدمت کا کام کررہے ہیں، ان کا کام، حالات کی نزاکت اور ہمہ گیر چیلنج کے اعتبار سے قابل قدر شمار ہوگا۔ اس سلسلہ میں کتاب میں جن شخصیتوں اور جدید اسلام کے جن علمبرداروں پر تنقید کی گئی ہے، بالخصوص مولانا زاہدالراشدی صاحب پر، اس کے لئے میں ان سے معذرت چاہوں گا۔

تاہم یہ عرض کئے بغیر بھی نہیں رہا جا سکتا کہ حالات چاہے کیسے بھی ہوں، قرآن نے ہمارے لئے **اھدنا الصراط المستقیم** (ہمیں سیدھا راستہ دکھا) کے جواب

میں **صراط الذین انعمت علیھم** (ان لوگوں کا راستہ جو انعام یافتہ ہیں) کی واضح ہدایت فرمائی ہے۔ یہ انعام یافتہ افراد صحابہ کرام اور سلف صالحین ہی ہیں۔ سلف صالحین کی راہ ہی دراصل قرآن وسنت اور اسلام کی راہ ہے۔ یہی امت کا تسلسل ہے۔ یہی صحیح اور حقیقی اسلام کا راستہ ہے۔ سلف صالحین کی راہ سے ہٹنے کے بعد اکثر دیکھا گیا ہے کہ افراد کا تزکیہ نہیں ہو پاتا، سیرت وکردار میں پاکیزگی نہیں ہو پاتی۔ باطنی بیماریاں شدت سے موجود ہوتی ہیں۔ اسلام کی ظاہری شکل یا اسلام کی وکالت کے حوالے سے کردار تو کچھ نہ کچھ موجود ہوتاہے، لیکن ایمان اور اللہ کی محبت کی گہرائیاں موجود نہیں ہوتی۔ چنانچہ صحیح اسلامی خطوط جو سلف صالحین کی راہ اور قرآن وسنت کا ورثہ ہے۔اس راہ کی نشاندہی کرنا اور صحیح تعمیر سیرت اور تزکیہ کے خطوط متعین کرنا ناگزیر ہے، کتاب میں اس وسیع تر اسلامی مقصد کی خاطر بعض علماء ووصوفیا اور دانشوروں پر تنقید کی گئی ہے،تاکہ قرآن وسنت کے سلف صالحین کے اسلام کے امتیازی خطوط سامنے آسکیں اور وہ اور نمایاں رہیں اور ان سے نگاہیں اوجھل نہ ہونے پائیں۔

امید ہے کہ اس وضاحت کے بعد کتاب میں کی گئی تنقید کو زیادہ محسوس نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ صحیح اسلامی فکری خطوط جو امت کا ورثہ ہیں، اس کی نشاندہی کرتے رہنا، بالخصوص زوال کے دور میں اس کی توضیح کرتے رہنا، نہ صرف وقت کی ضرورت ہے، بلکہ یہ دینی فرائض میں شامل ہے۔ کیسا عجیب دور آ گیا ہے کہ مجھ جیسا نااہل اور غیر عالم فرد حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب جیسی فاضل علمی شخصیت پر تنقید کررہا ہے۔

مولانا سے درخواست ہے کہ وہ محبت سے کی گئی اس تنقید پر ضرور غور وفکر فرمائیں گے، اس تنقید میں اگر کہیں زیادتی ہوئی ہے تو اس سیاہ کار کو معاف فرمائیں گے۔

ساتھ ساتھ اپنے جیسے صوفیا سے بھی معذرت خواہ ہوں کہ کتاب میں ان پر تنقید کی گئی ہے،اس کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم حب جاہ وحب مال اور جذبہ شہرت سے بچنے کے لئے کوشاں ہوں، تاکہ معاشرہ میں اہل تصوف کے بارے میں یہ جو عمومی ذہن بن گیا ہے کہ ان کا مقصود تصوف وبزرگی کے نام پر دولت کمانا اور مالدار سے مالدار تر بننے کے سوا کچھ بھی نہیں، یہ تاثر ختم ہو اور سلف صالحین کا یہ ادارہ اس دور میں بھی مالداروں سے مشابہت پیدا کئے بغیر محض للہ فی اللہ لوگوں کی اصلاح وتربیت اور تزکیہ کا فریضہ سرانجام دے۔